شادی کے سلسلہ میں جہیز نقد رقم کا مطالبہ :- از مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۴۰، قیمت دو روپیے پتے (۱) امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ، بہار (۲) مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ لکھنؤ۔

اس زمانہ میں جہیز وغیرہ کے مطالبہ کی وجہ سے بچیوں کی شادی کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور دشوار ہوتا جارہا ہے۔ اس پر دردمند اور ذمہ دار علمار اور مسلمانوں کی تشویش واضطراب بالکل بجا ہے۔ اس کتابچہ میں حدیثوں کے علاوہ فقہا اور مفتیوں کے اقوال سے یہ ثابت کیا گیا ہے۔ کہ ایسے مطالبہ کی بنیاد پر ملنے والی رقم شرعاً رشوت ہوگی جس کا لینا دینا اور اس کے لیے واسطہ بننا سب حرام ہے، اور از روے حدیث ایسے سب لوگ ملعون ہوتے ہیں"۔ اسلام کے معاشرتی مسائل و عائلی قوانین کے مختلف پہلوؤں پر فاضل مصنف کی اچھی اور گہری نظر ہے۔ اس لئے انھوں نے اس مسئلہ پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یہ کتابچہ اس لائق ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔ اور یہ ہر مسلمان کے مطالعہ میں بھی آئے۔

عکسِ آئینہ :- از جناب غوث محمد غوثیؔ، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۳۲ مع خوبصورت کور، قیمت ۳۵ روپے پتے (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، (۲) غوث محمد غوثیؔ، سرائے رحمٰن، علی گڑھ۔

"عکسِ آئینہ" جناب غوث محمد غوثیؔ کی غزلوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ انھیں غزل سے زیادہ مناسبت ہے۔ اور یہ مجموعہ متعدد اچھی اور کامیاب غزلوں پر مشتمل ہے اور اس سے مصنف کی فن پر قدرت اور اظہار بیان کے سلیقہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک پختہ مشق شاعر ہیں اور انھوں نے عصری میلانات کو قدیم شاعری کے باوقار انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر سے ان کے اندازِ طبیعت اور رنگِ سخن کا اندازہ ہوگا ؎

جہاں اربابِ محفل خالی از دردِ جہاں ہوں گے مرے نغمے وہاں ذوقِ سماعت پہ گراں ہوں گے

جلد ۱۳۹ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۱ء عدد ۶

مضامین

شذرات سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

اسلام کی معاشرتی زندگی مستشرقین کی نظر میں ڈاکٹر عبدالوہاب بوحدیبہ ڈائرکٹر مرکز الدراسات الاقتصادیہ۔ تونس۔ مترجمہ حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دارالمصنفین ۴۰۵-۴۲۴
عربی زبان وادب میں ہندوستانی علماء کا حصہ عالی جناب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ ۴۲۵-۴۳۷
ابلیس و بشر اور اقبال ڈاکٹر محمد منصور عالم شعبۂ اردو و فارسی مگدھ یونیورسٹی۔ بہار ۴۳۸-۴۶۲
القول الجلی و اسرار الخفی کا نسخہ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ جناب فضیل احمد قادری خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴۶۳-۴۷۴
مطبوعات جدیدہ "ض" ۴۷۵-۴۷۶

بابری مسجد

اس رسالہ میں اجودھیا کی تاریخی بابری مسجد کے ماله وما علیہ پر تاریخ کی کتابوں، حق پسند ہندوؤں کے بیانوں اور عدالتوں کے فیصلوں کی مدد سے نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت :- ۲۰ روپیے

شذرات

امیر خسرو کے کچھ قدر دانوں اور مداحوں نے شکاگو (امریکہ) میں امیر خسرو سوسائٹی آف امریکہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے، جس کی نگرانی میں ۲۹ مئی ۸۰ء سے ۲ جون ۸۰ء تک ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی، یہ امیر خسرو کی مقبولیت اور محبوبیت کی دلیل ہے کہ ان کے مولد، مسکن اور مرقد سے بہت دور شکاگو جیسی جگہ میں ان کے کارناموں پر عقیدت کے پھول نچھاور کیے گئے۔

اس سوسائٹی کے اصلی روح رواں ہندوستان اور پاکستان کے اولوالعزم اور جوان ہمت افراد ہیں گو امریکہ کے کچھ باذوق اہل علم کا تعاون بھی اس کو حاصل ہے، اس کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں جو لوگ ہیں، ان کے ناموں کی بڑی لمبی فہرست ہے، اس کے صدر جناب ڈاکٹر حبیب الدین احمد ہیں جو حیدرآباد کے رہنے والے ہیں اور اس وقت شکاگو میں انجینئر ہیں، اس کی آرگنائزنگ کمیٹی کے صدر جناب نقی اختر صاحب ہیں، جو پاکستانی ہیں، اور شکاگو میں سائنس کے استاد ہیں، اس کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر ظفر اقبال تھے، جو لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق استاد جناب شجاعت علی سندیلوی کے لڑکے ہیں، اور وہاں ایک سائنس داں کی حیثیت سے مشہور ہیں، کچھ کتابوں کے مصنف بھی ہیں، اس کے اگزیکیٹیو ڈائرکٹر ایک امریکن ووڈمین ٹیلر ہیں، جو کانفرنس کے ہر کام کو انجام دینے میں بڑی تندہی سے پیش پیش تھے، اس بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے ہر جگہ کے اہل علم بلائے گئے، جس میں ہندوستان سے تیرہ، پاکستان سے پانچ، بنگلہ دیش سے ایک اور پھر امریکہ کے کچھ نمائندے شریک ہوئے، ہر وارڈ یونیورسٹی کی مشہور پروفیسر اینی میری شمیل کی شرکت کی وجہ سے اس میں بڑا وزن اور وقار پیدا ہوگیا تھا، میرے نام سے بھی دعوت نامہ تھا، امیر خسرو سوسائٹی آف امریکہ کے ایما پر جناب حکیم عبد الحمید صاحب ہمدرد نگر تغلق آباد دہلی نے اپنی بے پایاں کرم گستری اور علم نوازی کی بدولت میرے سفر کے اخراجات برداشت کیے، جس کے لیے ان کا بے حد شکر گزار ہوا، شکاگو سے خبر ملی تھی کہ میرے لیے امریکن ہوائی جہاز سے ۲۸ مئی کو جگہ مخصوص کردی گئی ہے، لیکن بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے اعظم گڈھ سے دہلی پہونچا تو اس روز امریکہ کے سفارت خانہ سے ویزا نہ مل سکا، میرے لڑکے شاکر الرحمٰن نے اپنی مستعدی اور کوشش سے ۲۸ مئی کو تھائی لینڈ کے ہوائی جہاز ٹی۔ جی۔ ۱۰۹ میں جگہ مخصوص کرائی، دوسرے دن امریکہ کے سفارت خانہ سے دو گھنٹے کے اندر ویزا مل گیا، جس آسانی، عزت اور باوقار طریقہ سے، اس روز تقریباً پانچ سو آدمیوں کو ویزے دیے گئے، اس سے پاکستان کے سفارت خانہ کو درس لینا چاہیے، جہاں ویزا حاصل کرنا بڑا صبر آزما کام ہوتا ہے،

سفر میں جو اور دشواریاں پیش آئیں، ان کو جناب اوصاف علی صاحب ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز ہمدرد نگر دہلی نے دور کردیں، جس کے لیے ان کا بھی شکر گزار ہوا، ۳۰ مئی کو تین بجے رات کو ہوائی جہاز میں بیٹھا، لندن میں اس ہوائی جہاز کو چھوڑ کر ٹی۔ ڈبلیو۔ اے کے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر شکاگو جانا تھا، لندن کے ہوائی اڈے پر عملہ نہایت اخلاق سے پیش آیا، تین گھنٹے انتظار کے بعد شکاگو کے لیے ہوائی جہاز پر بیٹھا تو لندن میں اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے، آٹھ گھنٹے کے ہوائی سفر کے بعد شکاگو پہونچا تو وہاں دن کے ڈیڑھ بجے تھے، ٹیلیفون سے امیر خسرو سوسائٹی والوں کو خبر دی تو ایک گھنٹے کے اندر سوسائٹی کے ایک بہت سرگرم، مستعد اور متحرک رکن جناب محمد عبد الحق صاحب پہونچ گئے، جو وہاں انجینئر ہیں، ان کو سراپا اخلاق، اخلاص اور محبت پایا، وہ اپنے ساتھ پہلے سوسائٹی کے ایک معزز رکن ڈاکٹر محمد ایم۔ فاروقی کی رہائش گاہ پر لے گئے، جہاں ممبئی سے جناب ظ۔ انصاری اور شانتی نکیتن سے جناب پروفیسر محمد طاہر علی آکر ٹھہرے ہوئے تھے، وہیں پاکستان کے جناب عبد الصمد حسین رضوی سے ملاقات ہوئی، یہاں سے جناب عبد الحق صاحب وہاں لے گئے جہاں میرے قیام کا انتظام تھا، یہ ڈاکٹر نوید مشرف کا خوبصورت بنگلہ تھا، ان کا آبائی وطن تو دہلی تھا، مگر اب ان کا خاندان اسلام آباد پاکستان میں آباد ہے، وہ تقریباً سات سال سے شکاگو میں ڈاکٹر ہیں، ان کی بیگم صاحبہ فلپائن کی ہیں، دونوں بڑی خندہ پیشانی اور ہر قسم کے لطف و کرم کے ساتھ پورے قیام کے زمانے میں پیش آئے۔ جس سے یہ سفر اور خوشگوار رہا، اگر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرتا تو اتنا آرام نہیں ملتا جتنا یہاں ملا، یہیں جناب عبد الصمد حسین رضوی کا بھی قیام رہا، وہ کراچی سے آئے ہوئے تھے، وہاں چیف انجینئر ہوکر ریٹائر ہوئے ہیں، ان کا آبائی وطن علی گڈھ تھا۔

۲۹ مئی کو جمعہ تھا، جمعہ کی نماز ایک چیپل یعنی چھوٹے گرجا کے ایک گوشہ میں پڑھی، کیونکہ قریب کوئی مسجد نہ تھی نماز پروفیسر فضل الرحمان نے پڑھائی جو پہلے اسلام آباد میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے، اب شکاگو کی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، اسی کے بعد کانفرنس کا افتتاح تھا، وہاں جانے سے پہلے قیام گاہ پر

ڈاکٹر حبیب الدین احمد کا ٹیلیفون آیا کہ میں امیر خسرو کی عبقریت پر ایک مقالہ تیار کرکے کانفرنس کے لیے لیتا آؤں تو بہتر ہوگا، میں اپنا مقالہ ایک دوسرے موضوع پر لکھ کر لایا تھا، جناب حبیب الدین احمد کی فرمائش پر مقالہ لکھنے بیٹھ گیا، تو اتفاق سے تین چار گھنٹے کی محنت میں تیار ہوگیا، کانفرنس کے نمایندوں کا خیر مقدم ڈاکٹر ظفر اقبال نے کیا، اس کا افتتاح جناب تقی اختر کی صدارت میں ہارورڈ یونیورسٹی کی پروفیسر اینے میری شمیل کے کلیدی خطبہ سے ہوا، اس سے پہلے پاکستان اور ہندوستان میں ان کی تقریریں سن چکا تھا، مگر اس روز ان کا یہ اتار رنگ نہ تھا، امیر خسرو کی کچھ خاص خاص باتیں زبانی کہہ کر بیٹھ گئیں، اس کے کچھ وقفہ کے بعد مقالہ خوانی کا اجلاس شروع ہوا، تو اس کی ابتدا میرے مقالہ ہی سے کی گئی، جو چند گھنٹے پہلے لکھا گیا تھا، اس کو سن کر جناب حبیب الدین احمد نے مجھ سے مل کر کہا آپ تو معلومات کے سمندر ہیں۔

اس میں جو اور مقالات پڑھے گئے، وہ یہ تھے، امیر خسرو کا عشق از پروفیسر شمس الدین (سری نگر کشمیر)، امیر خسرو کی غزل گوئی، از ڈاکٹر نور الحسن انصاری (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر انصاری نے اپنا مقالہ موثر انداز میں پڑھا، جو عام طور سے پسند کیا گیا، ان مقالوں پر تبصرہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے ماہرانہ انداز میں کیا، اجلاس کے خاتمہ پر ڈاکٹر اینے میری شمیل سب سے بے تکلفانہ انداز میں ملتی رہیں، مجھ سے ملیں تو کہنے لگیں کہ کراچی میں سید حسام الدین راشدی مرحوم آپ کے بہت قدرداں اور مشتاق رہے۔

ہم لوگ جہاں مقیم تھے، وہاں سے کانفرنس کے جلسہ کی جگہ تقریباً تیس میل دور واقع تھی، آنے جانے میں شہر کو دیکھنے کا موقع ملا، پورا شہر ایک جھیل کے کنارے آباد ہے، جھیل کاہے کو ہے، ایک طویل دریا ہے، یہ شہر زیادہ تر کاروباری ہے، امریکن ذوق کے مطابق بسایا گیا ہے، درخت، جنگل اور ڈھلوان ٹیلے پہلے ہی کی طرح محفوظ رکھے گئے ہیں، انہی کے پیچھے مکانات ہیں، جو دہلی اور کراچی کی طرح بڑے بڑے محل نما نہیں ہیں، ضرورت کے مطابق اوسط درجے کے ہوتے ہیں، مگر اندر راحت و آسائش کے سارے سامان ہوتے ہیں، سڑکوں پر صرف موٹریں دکھائی دیتی ہیں۔ پیادہ پا چلتے، یا کسی کو اسکوٹر یا سائیکل پر سوار نہیں دیکھا، پٹرول بہت ہے، جس قیمت پر ہندوستان میں ایک لیٹر ملتا ہے، وہاں ایک گیلن مل جاتا ہے۔

۴ر مئی کو کانفرنس میں مقالہ خوانی کا دوسرا اجلاس شکاگو یونیورسٹی کے ایک کمرہ میں ہوا، یہ شکاگو کی

بہترین یونیورسٹی سمجھی جاتی ہے، اس کی شاندار عمارت اور اس کے مختلف کمروں کی زینت و آرائش کو دیکھ کر یہاں کی تعلیم کی اہمیت کا خود بخود اندازہ ہوگیا، اس یونیورسٹی کے علاوہ شہر میں بہت سی اور یونیورسٹیاں ہیں جن کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی، دوسرے اجلاس کے خصوصی مہمان پروفیسر منیب الرحمن تھے، جو اس وقت اوکلینڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، اس میں ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ) نے امیر خسرو اور ہائے مختفی کے استعمال پر بڑا پر مغز مقالہ پڑھا، جس کو شکاگو یونیورسٹی کے ایرانی پروفیسر حشمت مؤید نے خاص طور سے پسند کیا، اس کے بعد خود ڈاکٹر حشمت نے ہفت اختر کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا، جس میں یہ دکھایا کہ اس میں عبدی بیگ نے امیر خسرو سے کیا کیا چیزیں لی ہیں، جناب ظ انصاری صاحب بمبئی سے خسرویات کی وہ ساری چیزیں نمائش کے لیے ساتھ لائے تھے، جو ۱۹۷۶ء میں دہلی میں خسرو کے سات سو سالہ جشن کے موقع پر جمع کی گئی تھیں، اس اجلاس میں ان کا مقالہ اس عنوان پر تھا کہ ایک منتشر معاشرہ میں ایک عبقری کے سامنے کیا کیا مسائل ہوتے ہیں، اسی روشنی میں امیر خسرو کو پیش کیا، اس کے بعد جناب عبد الصمد حسین رضوی نے اپنا مقالہ امیر خسرو کی ایجاد کردہ نجمانہ شاعری کے عنوان سے پڑھا، اور زبانی بے شمار اشعار سنائے، جس سے سامعین حیرت زدہ تھے، وہ امیر خسرو کے زائچے اور جداول کو نقشے کے ذریعہ سے بھی دکھاتے جا رہے تھے۔

اسی روز اس سلسلہ کا دوسرا اجلاس سہ پہر کو شروع ہوا، تو امیر خسرو کی ہندی اور اردو شاعری پر بھی روشنی ڈالی گئی، پروفیسر گوپی چند نارنگ (دہلی یونیورسٹی) اپنی کتاب امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن ذخیرۂ اسپرنگر پر تقریباً ایک گھنٹہ تک انگریزی میں پوری طلاقت لسانی سے بولے، یہ کتاب امیر خسرو سوسائٹی آف امریکہ نے اپنی طرف سے شائع بھی کر دی ہے، اس میں ذخیرۂ اسپرنگر سے جو پہیلیاں جمع کر دی گئی ہیں، ان کے متعلق پروفیسر نارنگ کی رائے ہے کہ اس میں کچھ پہیلیاں ایسی ہیں، جو الحاقی ہیں، تو بڑا حصہ ایسا بھی ہے، جس کو غیر معتبر سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں، اس کے بعد جناب شجاعت علی سندیلوی نے امیر خسرو کی ہندی شاعری پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے امیر خسرو کے ہندی کلام کا ایک مجموعہ ہندی زبان میں مرتب کیا ہے، اس کو بھی امیر خسرو سوسائٹی آف امریکہ نے اپنی طرف سے شائع کیا ہے، جناب شجاعت علی سندیلوی کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی پروفیسر شریف النساء نے مقالہ امیر خسرو اور ہندوستانی کلچر کی جھلکیاں کے عنوان سے پڑھا۔

اسی رات کو شکاگو یونیورسٹی کے انٹرنیشنل ہال میں ایک پرتکلف استقبالیہ دعوت ہوئی، جس میں پاکستان کے قونصل اور بنگلہ دیش کے جناب بدر الدجیٰ بھی شریک ہوئے، اس میں کلیدی خطبہ امریکہ کی

نارتھ ایسٹرن الی نوائے یونیورسٹی کے ڈاکٹر گورڈن ایچ لیمب کا تھا، اس کی ابتداء ڈاکٹر آصفہ زمانی نے امیر خسرو کی ایک فارسی غزل کو بڑے اچھے ترنم کے ساتھ پیش کر کے کی، اس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور جناب شجاعت علی سندیلوی کی کتابوں کا اجراء بھی ہوا، پھر اینے میری شمیل کو نشانِ خسرو، ڈاکٹر نذیر احمد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور جناب شجاعت علی سندیلوی کو نذرِ خسرو کے ایوارڈ امیر خسرو سوسائٹی امریکہ کی طرف سے پیش کئے گئے، شیو کمار شرما ستار نواز کو اور ذاکر خاں طبلہ نواز کو بھی ایوارڈ دئے گئے۔

---

۳۰ مئی کو مقالہ خوانی کے اجلاس میں پروفیسر فضل الرحمٰن نے ایک مقالہ پڑھا جس میں سماع کا زیادہ ذکر تھا، پھر پروفیسر ابوالخیر کشفی (کراچی یونیورسٹی) نے امیر خسرو اور تصوف پر ایک دل نواز مقالہ اردو میں پڑھا۔ پروفیسر اینے میری شمیل نے امیر خسرو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید کی حیثیت سے کے عنوان سے اپنے کچھ خیالات کا اظہار کیا، بحث و مباحثہ کے موقع پر میں نے سماع اور مزامیر پر جب اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ علمائے صالحین اور شریعت پسند صوفیائے کرام مزامیر کے ساتھ سماع کو جائز قرار نہیں دیتے تو بعض لوگوں کو یہ رائے پسند نہ آئی، مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جنھوں نے میری تائید کرتے ہوئے کہا کہ شریعت کا قانون اٹل ہوتا ہے، بدلا نہیں جاسکتا ہے۔

یکم جون کے اجلاس میں جناب شہاب سرمدی (علی گڈھ) اور میرا مقالہ امیر خسرو کی موسیقی پر تھا، جناب شہاب سرمدی نے بتایا کہ اعجاز خسروی میں موسیقی پر جو باب ہے، اس کا انگریزی ترجمہ انھوں نے کرلیا ہے، یہ بڑا اہم کام انجام پاگیا ہے، اس ترجمہ کے بعد امیر خسرو کی موسیقی کے کمالات کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہوجائے گی، کیونکہ اعجاز خسروی کی تہ بہ تکلف صنائع بدائع اور استعارات و تشبیہات سے بھری ہوئی انشاپردازی میں امیر خسرو کا فن گم ہو کر رہ گیا ہے، میں نے بھی اسی اعجاز خسروی اور امیر خسرو کی مثنویوں کے ذریعہ ان کی موسیقی کے فن کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی، اس اجلاس کے صدر ڈاکٹر بریان سلور تھے، جو وائس آف امریکہ کے ریڈیو میں اردو شعبہ کے انچارج ہیں، اور موسیقی کے بھی استاد ہیں، وہ میرے مقالہ پر دیر تک باتیں کرتے رہے، کلمات خیر بھی کہے، میں نے ان سے عرض کیا کہ امیر خسرو کی ہر چیز سے مجھکو دلچسپی رہی ہے، اس لیے میں نے ان کی موسیقی کا مطالعہ صرف ایک اسکالر کی حیثیت سے، ماہر موسیقی کی حیثیت سے نہیں کیا ہے، امیر خسرو کی

موسیقی پر کلیفورنیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر جے۔ انڈریو گریگ اور کراچی کی افسر حسین صاحب نے بھی مقالے پڑھے۔

آخری اجلاس ۲ جون کو ہوا، جس میں کراچی کے پروفیسر ممتاز حسین نے امیر خسرو اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے تعلقات پر بعض تکلیف دہ رائے کا اظہار کیا، بنگلہ دیش کی کلثوم اے۔ بشر مزامدار نے امیر خسرو کی تمام مثنویوں پر اپنے انداز میں تبصرہ کیا، ان کا مقالہ اردو میں تھا، جس کو سن کر تعجب ہوا، مگر معلوم ہوا کہ وہ بمبئی کی ہیں، ان کی شادی بنگلہ دیش میں ہوئی ہے، دہلی کے شیخ سلیم احمد نے خسرو کے شعری کارناموں پر اپنی رائے کا اظہار کیا، لکھنؤ کی آصفہ زمانی نے مثنوی دول رانی اور خضر خان پر ایک مقالہ پیش کیا، لندن یونیورسٹی کے ضیاوالدین شکیب نے یہ بتایا کہ یورپ میں رہ کر اردو پڑھانے میں کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں، حیدرآباد کے ڈاکٹر مغنی تبسم نے امیر خسرو کی شاعری کو فن کی حیثیت سے باضابطہ چارٹ کے ذریعہ سے سمجھایا، جو یقیناً بہت ہی محنت سے تیار ہوا تھا۔

اس کانفرنس میں یہ بھی طے پایا کہ امیر خسرو کی اعجاز خسروی کا ترجمہ انگریزی میں کیا جائے، اس مشکل کام کے نگران علی گڈھ کے ڈاکٹر نذیر احمد مقرر ہوئے، افغانستان کے ڈاکٹر عبدالغفور رفرہادی نے دول رانی اور خضر خان کا انگریزی ترجمہ کرنے کی تجویز پیش کی، ایران کے ڈاکٹر حشمت موید نے خسرو اور نظامی کا تقابلی مطالعہ کرنے پر زور دیا، یہ بھی طے پایا کہ امریکہ کی یونیورسٹی میں امیر خسرو کے مختلف علمی، نثری اور شعری کارناموں پر باضابطہ ریسرچ کئے جائیں، اس کا دوسرا اجلاس دو سال کے بعد ۱۹۸۹ء میں ہوگا، ہر روز کی اجلاس کی کارروائیوں کو سنجیدہ اور باوقار بنانے میں جناب حبیب الدین احمد صاحب جانگسل محنت کرتے رہے، وہ امیر خسرو کے کارناموں کے بڑے دلدادہ نظر آئے، اختتامی اجلاس کو جناب نقی اختر صاحب نے اپنی ایک مختصر لیکن بہت مناسب تقریر سے مخاطب کیا، مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جناب حبیب الدین احمد صاحب کی ریاضت، عرق ریزی اور لگن کی بڑی تعریف کی جس کا اعتراف تمام بیرونی نمائندوں کو بھی تھا، اخیر میں نقی اختر صاحب سب سے گلے مل کر رخصت ہو رہے تھے، تو مندوبین کانفرنس کی کامیابی پر تمام عہدہ داروں اور کارکنوں کو مبارکباد پیش کر رہے تھے، اور ہم میں سے ہر فرد اس کی یادوں کی شمع ذہن میں روشن کرتا ہوا، ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہا تھا۔ شکاگو میں آٹھ روز قیام رہا، شہر کے اہم مقامات کی

سیر جناب عبدالحق اور پھر اپنے میزبان ڈاکٹر نوید مشرف کی معیت میں کی، وہاں کی سب سے عجوبہ روزگار عمارت سیئرٹاور ہے، جس میں ایک سو دس منزلیں ہیں، ڈاکٹر نوید مشرف اس کی ایک سو سات منزلوں تک اپنے ساتھ لفٹ کے ذریعہ سے لے گئے، اس کی حیرت انگیز چیز یہ نظر آئی کہ ہر منزل پر خرید و فروخت کی دکانیں تھیں، جس سے ایک چھوٹا سا بارونق شہر آباد دکھائی دیتا ہے تماشائیوں کا بڑا ہجوم رہتا ہے، انجینیرنگ کا بڑا کمال دیکھنے میں آیا، شہر کا میوزیم بھی دیکھا، جہاں انسان کی لاشیں بھی شاید قبروں سے نکال کر رکھی گئی تھیں، مگر اس شہر میں زیادہ دلچسپی بہائیوں کی شاندار عبادت گاہ سے ہوئی، ایک گنبد کی عمارت ہے، اس کی تزئین و آرائش میں اربوں روپیے خرچ ہوئے ہوں گے، ایک فلم کے پردے پر ہر تھوڑی دیر کے بعد بہائی مذہب کی خصوصیت بتائی جا رہی تھی، اس کے بانی بہاء اللہ اپنے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کر گئے ہیں، ان کی تعلیم یہ تھی کہ ہر مذہب اپنی جگہ پر صحیح ہے، اسی لیے ہر مذہب کی تعلیمات کو بہائی مذہب کا جزو بنا لیا گیا ہے، ہم لوگوں کو جو فلم دکھائی گئی، اس میں بتایا گیا کہ پوری دنیا میں اس مذہب کی ایک لاکھ بائیس ہزار عبادت گاہیں اب تک بنائی جا چکی ہیں، عبادت کرنے میں ہر مذہب کے پیرو کو اپنے اپنے مذہب کا انداز اختیار کرنے کی اجازت ہے، بڑے بڑے ہال اور کمروں میں خوبصورت کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، وہیں مذہبی اجتماع ہوتا ہے، اور وہی شاید ان کی عبادت ہے، ہم لوگوں کو بتایا گیا کہ ساری دنیا کی بہائی تنظیم ایک مجلس کی نگرانی میں کام کرتی ہے، شکاگو میں مسجدیں تو جا بجا ضرور ہیں، مگر بہائی مذہب کے عبادت خانہ کی طرح کوئی مسجد نہیں۔

شکاگو کے مختصر قیام میں برق و بخارات کے حیرت انگیز کارناموں کے ساتھ درخشندہ فلزات، بے چشمۂ حیواں کے ظلمات، رعنائی تعمیر میں رونق ہیں، صفا میں، گرجوں سے بہتر بنکوں کی عمارات، عریانی اور غازہ میں فرنگی مدنیت کے فتوحات، اور ساغر و مینا کے کرامات بھی دیکھے، مگر جب قیام گاہ سے مسٹر نوید مشرف نے جس محبت سے رخصت کیا، اور ہوائی اڈے پر جناب عبدالحق اور ڈاکٹر نوید مشرف نے جس مخلصانہ انداز میں اپنی یادوں کا معطر معطر ہار پہنا کر رخصت کیا تو معلوم ہوا کہ شکاگو بھی اپنے عزیزوں ہی کا شہر ہے۔

مقالات

اسلام کی معاشرتی زندگی مستشرقین کی نظر میں

از

ڈاکٹر عبدالوہاب ابوحدیبہ ڈائرکٹر مرکز الدراسات والابحاث الاقتصادیہ والاجتماعیہ تونس

ترجمہ:۔ حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی، رفیق دارالمصنفین

مستشرقین نے اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کے رسوم اور رواجوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی روشنی میں اگر اسلام کے حقیقی تمدن اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا جائزہ لیا جائے تو ان مستشرقین کے خیالات اور ان کی تحریروں کی تصدیق نہایت دشوار ہوگی۔

ہمارے اور مستشرقین کے نقطۂ نظر میں فرق اور اختلاف کا ہونا اس لحاظ سے فطری ہے کہ ہم اپنے ماحول اور اپنی تہذیبی قدروں اور ثقافتی روایتوں سے مانوس ہیں، اور وہ مادی، فکری اور معاشرتی اعتبار سے ہم سے جدا ہیں، وہ ہماری تہذیب کا مطالعہ اور تجزیہ بھی دور سے کرتے ہیں، لیکن ہمارے لیے ان مستشرقین کی رایوں اور تحریروں کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس طرح ہم کو اپنی تصویر پر ایک نظر ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے، اس سے قطع نظر کہ یہ تصویر کتنی سچی اور صحیح ہے، اور کس قدر مسخ اور غلط ہے۔

مختلف تہذیبوں کے درمیان موازنہ کیا جاتا رہا ہے، اور جب تہذیبیں ایک دوسرے سے قریب ہوتی ہیں تو موازنہ کا یہ عمل تیز تر ہو جاتا ہے، اسلامی تہذیب و ثقافت کا بھی جب

جانب داری اور تعصب سے ہٹ کر علمی اور اصولی لحاظ سے تجزیہ کیا گیا تو وہ ایک صاف شفاف قالب میں روشن نظر آئی لیکن جب تحلیل و تنقید کے اس عمل کی تہ میں نفرت، عداوت اور باطنی کدورت کی کارفرمائی ہوئی تو اسلامی تہذیب کے خط و خال کو داغدار کرکے پیش کیا گیا۔

مستشرقین نے اپنے مغربی ماحول میں جب اسلام اور اس کی تہذیب اور اس کی معاشرتی زندگی کا موازنہ دوسری تہذیبوں سے کیا تو وہ خود کو تعصب اور باہمی آویزش کے اثرات سے آزاد نہیں رکھ سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے باقاعدہ ایک منصوبہ کے تحت حقائق کو دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھا، سچائیوں کو غبار آلود کیا اور اسلامی طرز زندگی، فکر اسلامی کے عناصر اور اسلام کے عائلی نظام پر مختلف جہتوں سے الزام تراشی کی، عجیب بات یہ ہے کہ تلبیس و تحریف کا یہ انداز ذہنوں میں جلد جاگزیں ہو جاتا ہے، یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ ہمارے خلاف جو کتابیں اور تحریریں تیار کی جاتی ہیں ان کی اشاعت اور ان کا اثر و نفوذ ان کتابوں سے کہیں زیادہ ہے جو ہمارے مصنفین کی محنت کا نتیجہ ہیں، عوام کے علاوہ خواص بھی ایسی کتابوں سے زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ ایسے علمی حلقے جن کا عالم اسلام سے گہرا تعلق ہے وہ بھی ایسے غلط، بے بنیاد اور خرافات قصے کہانیوں اور روایتوں سے متاثر نظر آتے ہیں جن کو مستشرقین اپنی خواہش اور اغراض کے تحت اسلامی تہذیب کے نام پر پیش کرتے ہیں، ہمارے علمی حلقوں کا اس طرح متاثر ہونا ایک بڑے خطرہ کی علامت ہے، اسی لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ مستشرقین کے خیالات اور ان کی تحریروں کا سنجیدگی اور گہرائی سے جائزہ لیا جائے، تاکہ اسلام پر لگائے گئے ان الزاموں کا جواب دیا جا سکے، اور اصل حقیقت کو بھی علمی دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے، ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ نے ان مستشرقین کی کتابوں کو اوروں کی بہ نسبت زیادہ پڑھا ہے، اور اس کے نتیجہ میں ان کے ذہنوں میں اپنی تہذیب

و ثقافت سے متعلق شکوک و شبہات بلکہ نفرت و بیزاری کے جذبات پیدا ہوئے ہیں اس لیے ان مستشرقین کے خیالات کا محاسبہ اور بھی ضروری ہے تاکہ ہماری یہ نئی نسل اپنی قومی حمیت، اپنی تہذیب کی شایستگی و شرافت اور اپنے تاریخی ورثہ کی اصالت اور سچائی پر اپنے ایمان کو تازہ اور پختہ کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت عالم اسلام کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ پورے استشراق کے لٹریچر کو مکمل اور باضابطہ طور پر علمی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھا جائے، ان کے ادب کی تمام قسموں اور مختلف زبانوں میں متنوع موضوعات پر ان کی جتنی بھی کتابیں شایع ہوتی ہیں ان سے باخبر رہا جائے، اسی طرح ایسے بہت سے مسلمان مصنفین ہیں جن کی تحریروں اور طرز فکر میں مستشرقین کے خیالات کا عکس جھلکتا ہے تو ایسے مسلمان اہل قلم اور مصنفین کی کتابوں کا بھی سنجیدگی کر جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

استشراق کیا ہے؟ یہ درحقیقت مختلف بلکہ متضاد افکار و نظریات کے مجموعہ کا نام ہے، وقت اور ماحول کی مناسبت سے اس پر کبھی موضوعیت، کبھی غیر جانبداری، کبھی تحقیق اور صاف گوئی اور کبھی علم کے ناموں کے خوبصورت غلاف چڑھا دیے جاتے ہیں، ان پردوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کو حقیقت کے اصل چہرہ سے بے خبر رکھا جائے چنانچہ تنقید و تجزیہ کے نام پر موضوع سے جو انحراف کیا جاتا ہے اور مستند معلومات کا جو فقدان رہتا ہے، اور غیر اہم واقعات سے اہم نتائج کو اخذ کرنے میں جو عجلت کی جاتی ہے ان تمام علمی نقائص سے قاری کو ناواقف رکھنے میں یہ علمی غلاف بڑی حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن مستشرقین کی تحریروں کے یہ نقائص اور کمزوریاں اب اس طرح کھل کر سامنے آ رہی ہیں جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ مستشرقین کی کتابیں اور تحریریں صحیح اور غلط معلومات کا مرکب ہیں، اب مستشرقین.

کے لیے یہ آسان نہیں رہا ہے کہ وہ یورپ کے تنگ آسمان کے نیچے تعصب اور جانبداری کے ساتھ ایک ہی محور پر گردش کرتے رہیں، اور پھر اس عمل کو وہ علمی موضوعیت کا نام بھی دیں یورپ کی کئی نسلوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب کے بارہ میں جو واقفیت حاصل کی، وہ انھی مستشرقین کی تحریروں کے ذریعہ حاصل کی، بعض مستشرقین کی کتابیں بار بار شایع ہوئیں دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے بھی ہوئے، عربی زبان میں بھی بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا، ایسی ہی ایک کتاب ”قیم الاسلام الجنسیہ“ ہے، جس کے مصنف جارج بوسکی ہیں، یہ وہ کتاب ہے جس کو ایک تہائی صدی سے قارئین پڑھتے چلے آرہے ہیں، یہ یورپ کے نامور محققین کی نگرانی میں شایع ہوئی ہے اور اس کا ترجمہ انگریزی، اسپینی اور ہالینڈ کی زبانوں میں بھی ہوچکا ہے، اس کتاب کا موضوع مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے کسی ایسے پہلو سے متعلق نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ ایک دشوار، مشکل اور پیچیدہ اور بحث طلب مسئلہ ہے، اور اسلامی تہذیب کے کسی طالب علم کے لیے اس موضوع کو سمجھنے اور اس کے تحلیل وتجزیہ میں ایک مدت صرف ہوتی ہے، بلکہ اس کے برعکس اس نہایت اہم کتاب کا موضوع مسلمانوں کی جنسی زندگی ہے، اس کے بارہ میں مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر بہت محنت کی ہے اور بہت زیادہ مواد اور معلومات فراہم کیے ہیں، اور اس سلسلہ میں فقہ اسلامی کی کئی بنیادی کتابوں سے مدد لی ہے، ان کے قول کے مطابق ان کی نظر فقہ اسلامی کے ایک ماہر اور باخبر عالم کی نظر ہے، ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ چونکہ اب فقہ اسلامی سے اعتنا نہیں کیا جاتا اور اس کی حیثیت ایک فراموش شدہ باب کی ہوچکی ہے، اور مسلمانوں کے جدید متمدن طبقہ میں اسے طاق نسیان پر رکھ دیا گیا ہے، اس لیے ان کی یہ کتاب علم الاجتماع اور علم نفسیات کے ماہرین کے لیے ایک بنیادی مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، ان باتوں کے نتیجہ میں اس کتاب کو مطلوبہ اہمیت حاصل ہوگئی، اور اب اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے خواہ وہ مستشرق ہوں یا مسلمان اہل قلم ہوں اس کتاب پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہوگیا ہے، اور افسوس یہ ہے کہ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ لوگوں نے اس کتاب کی ان خامیوں اور غلط اور غیر مستند باتوں پر تنقید کی نگاہ ڈالی ہو، جن کو بڑی خوبصورتی اور چابک دستی سے اس کتاب میں چھپا دیا گیا ہے، مسلمانوں کی جنسی زندگی، ان کے عہد شباب کے میلانات، ان کی لذت اندوزی اور اس کے لیے ان کی تگ ودو وغیرہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے، جس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا ہے، وہ جنسی معاملہ میں بے صبر اور بے قید ہے، اور اس کے لیے وہ خود قانون واخلاق کے دائرے بناتا اور سمیٹتا ہے، جارج بوسکی اپنے اس نتیجہ تحقیق کو فقہ اسلامی کی روشنی میں ثابت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، حالانکہ اس کتاب میں علم کے نام پر تحریف اور اس کے بعد واقعات کو مسخ کرنے کا عمل اور اس کے بعد مذاق اور استہزار کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اور آخر کار بات اس پر ختم ہوئی ہے کہ اسلامی تہذیب وثقافت کی صورت انتہائی گھناونی اور بدترین ہے۔

جب نامور مستشرق کی نامور ترین کتاب کا یہ عالم ہے تو پھر علم، انصاف اور سچائی کا تقاضا یہ ہے کہ ان مستشرقین کے کارناموں کا نہایت سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے اور خالص علمی تنقید وتجزیہ کے ذریعہ ان کے طرز فکر اور منہاج تحقیق کا محاسبہ کیا جائے، علم وعدل پر یہ احسان ہوگا کہ ان مستشرقین کی تدلیسات کا پردہ فاش ہو، اور ان کی کتابوں اور ان کے مراجع ومصادر میں ان کی غلطیوں اور تحریفوں کی نشان دہی کی جائے۔

مستشرقین کی کتابوں پر تنقید وتجزیہ کرتے وقت ان کے سماجی اور تاریخی پس منظر پر بھی توجہ دینا بہت ضروری ہے، مثلاً یہ کہ یورپ میں سماجی علوم کب رائج ہوئے، اور کب ان کو اسلامی معاشروں پر منطبق کرنے کی کوشش کی گئی، انیسویں صدی کے اوائل میں فرانس، برطانیہ اور

جرمنی میں جو فکری انقلاب رونما ہوا، اس کی تاریخ پر جن کی نظر ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں یورپ کا دامن اقتصادی اور جغرافیائی دونوں طرح سے وسیع اور کشادہ ہوا، اور اس کے سایہ میں سماجی علوم کے نئے نئے نظریات کا ظہور ہوا، یورپ کی یہ نئی کروٹ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھی، اس کا آغاز اسی وقت ہوگیا تھا جب یورپ نے دوسرے براعظموں پر حملے شروع کردیے تھے، اور خالی اور غیر آباد علاقوں پر اس کا تسلط قائم ہونے لگا تھا اور ان پر نئی دنیاؤں کا انکشاف شروع ہوگیا تھا، اس کے بعد قبضہ وتسلط برقرار رکھنے اور نوآبادی قائم کرنے کے لیے خود ان میں آپس میں کشمکش شروع ہوئی اور اس طرح نوآبادیوں کی تقسیم ہوئی، ان میں نئی بستیاں بسائی جانے لگیں، اس عمل کے لیے گو محض اقتصادی اور عسکری قوت ہی کافی تھی تاہم یورپ نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ اپنے اس قبضہ اور تسلط اور سامراجی حرکت کو کسی اور رنگ وروغن سے مزین کرکے پیش کرے، ان کے فلسفۂ جمہوریت اور فلسفۂ حریت میں مفتوح قوموں کے لیے جاذبیت نہیں تھی، اس لیے کہ سامراجی ارادوں کے ساتھ یہ فلسفے بے معنی تھے، اس حقیقت کے پیش نظر انھوں نے دوسری راہوں سے مفتوح قوموں کو مرعوب کرنے کی کوششیں شروع کیں، ان ہی کوششوں میں سے ایک کوشش فلسفۂ تہذیب یا سماجی علوم کے نئے اصولوں کی تدوین تھی، اس وقت سے لے کر آج تک ذہنوں کو یہ باور کرانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ مختلف تہذیبیں اور ثقافتیں اور معاشرے اور مذاہب ایک دوسرے سے ممتاز ہیں، اور یہ سب ارتقاء اور فنا کے مرحلوں سے گذرتے رہے ہیں، اور ان سب کے آخر میں نظریۂ عقل ہے جو دوسری عالمگیر جنگ کے بعد گویا تہذیب کا قول فیصل ہے، اور یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ انسانیت اپنے تاریخی ارتقاء کے مراحل میں مختلف تہذیبوں سے ہوکر گذرتی رہی ہے، اور اب مغربی تہذیب انسانیت کے اس سفر کی منزل مقصود ہے، کیونکہ اس سے

پہلے کے معاشرے اور تہذیبیں ابتدائی اور ناقص حالت میں تھیں، جن میں جنگل کی زندگی قتل وغارت گری، قبائلی زندگی، جہالت، فقر، اور پس ماندگی وغیرہ جیسی غیر مطلوب اشیاء کا عمل دخل تھا، یورپ کے اس فلسفہ کے دو پہلو ہیں، ایک تو عملی دوسرا نظری، عملی پہلو سے یہ بات ظاہر ہے کہ یورپ کا تمدن اور ان کی تہذیب وثقافت ہی نمائندہ ثقافت ہے، اور وہ نہ صرف یہ کہ اپنے ضمیر بلکہ پوری تاریخ کے سامنے دوسری پس ماندہ اقوام کے بارے میں جواب دہ ہیں، اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان قوموں کو اپنے قبضہ میں لے کر ان کو تہذیب کے معانی سے آگاہ کریں، اور اس کے بعد ان قوموں کو اقتصادی، اجتماعی اور تہذیبی بلندیوں سے ہم کنار کریں۔

یہی وہ فلسفہ ہے جس کو رڈیارڈ کپلن نے ”سفید آدمی کا بوجھ“ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، اور اسی فلسفہ کو فرانسیسی اساتذہ اپنے شاگردوں کو استعمار کے نام گریجویشن کے درجات میں پڑھاتے تھے، اگر یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ ساری کاوشیں دراصل اپنے نفس کے اطمینان اور ضمیر کی راحت کا سامان تھیں، ساتھ ہی مقبوضہ قوموں کے لیے یہ ایسی پرفریب تھیں کہ یورپ کی فوجیں ان پر مسلط ہیں اور سرمایہ دارانہ کمپنی کے صاحب بہادر ان کا استحصال کرتے رہیں، اور ان محکوم قوموں کو یورپ کی اس زہرناکی کا احساس ہی نہ ہو۔

لیکن یورپ کی اس نام نہاد تہذیب کے علمبرداروں کی نگاہوں سے یہ بات پوشیدہ رہی کہ اسلامی قومیں خواہ وہ عربی ہوں یا غیر عربی، وہ اپنی قدیم وراسخ تہذیبوں کا قابل فخر سرمایہ رکھتی ہیں، جو یورپ کی جدید تہذیب وثقافت سے کسی طرح کم نہیں، یورپ کی نگاہیں اس سے بھی بے خبر ہیں کہ یہ تہذیبیں اپنے کردار اور اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فائق ہیں، بعض تہذیبوں کے ذکر سے کتابوں کے صفحات بھرے ہوئے ہیں، بعض معاشروں نے حیرت ناک کارنامے

انجام دیے ہیں، بعض تہذیبیں اپنی معرفت کی منزل میں ہیں، اس لیے صحیح موقف یہ ہونا چاہیے تھا کہ تہذیبوں اور تمدنوں میں جو فرق ہوتا ہے اور جزئیات میں جو اختلاف ہوتا ہے علم تہذیب کے یہ ماہرین تفصیل سے ان کو واضح یا ایک دوسرے سے موازنہ اور بنیادی اور ضمنی دونوں طرح سے ان کا مطالعہ باریک بینی سے کرتے، مگر اس کے بجائے ان تہذیبوں کا صرف مغربی تہذیب سے موازنہ کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مغربی دانشوروں، محققوں اور تمدن کے علمبرداروں کے درمیان اور ان کے مقبوضہ ممالک کے معاشروں اور تہذیبوں کے درمیان اور ایک خلیج کا احساس عام ہونے لگا۔

اسی احساس کا یہ ثمرہ تھا کہ اسلامی قومیں گو یورپ سے مغلوب ہوئیں اور فوجی لحاظ سے شکست سے دوچار ہوئیں، تاہم وہ ذہنی اور عقلی لحاظ سے یورپ کے سامنے سپر انداز نہیں ہوئیں، انھوں نے اپنے ماضی وحال کی تہذیب اور معاشرت سے رشتہ قائم رکھا، گو یہ رشتہ کہیں کہیں کمزور بھی ہوا لیکن مجموعی حیثیت سے اپنے تہذیبی ورثہ کی حفاظت کے احساس نے ان کو مغربی تہذیب وطاقت کا مقابلہ کرنے میں مدد کی، اور اب تو یہ حقیقت عام ہے کہ اسلام پسپا نہیں ہوا، مسلمانوں نے سر تسلیم خم نہیں کیا، اور مغرب ومشرق کے درمیان یہ کشمکش کوئی آخری، حتمی اور فیصلہ کن چیز نہیں تھی، بلکہ یہ یورپ اور عالم اسلام کے درمیان قدیم آویزش کا محض ایک حصہ تھی۔

مستشرقین نے بھی اس حقیقت کو پالیا کہ ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام ہے، جو ہر مقابلہ کی طاقت رکھتا ہے، اور سمندر پار کے ممالک میں جب تک اس کی جڑیں مضبوط رہیں گی اس وقت تک مغربی سامراج کو دوام نہیں حاصل ہو سکتا، اسی لیے ان مستشرقین نے ضروری سمجھا کہ وہ اپنے سماجی علوم اور اس کے نظریات کو "اسلامی قوموں کے مطالعہ" کے نام سے منتقل کریں اور اسلامی تہذیب کا جائزہ لیں، تاکہ اس کو ابتدائی تہذیبوں کی فہرست میں رکھا جا سکے۔

مستشرق رینی مونی نے "علم الاجتماع الجزائری" میں اپنے اس منصوبہ کو واضح کیا، انھوں نے یہ لکھا ہے کہ ان کی یہ کوشش اس تحقیق ومطالعہ سے بنیادی طور پر مختلف نہیں ہے جو ان سے پہلے کے مستشرقین مثلاً مستشرق صاباتیہ نے "علم الاجتماع الاہلی" کے عنوان کے تحت پیش کی ہے۔

ان ہی مستشرق رینی مونی نے اپنی مذکورہ کتاب میں یہ لکھا ہے کہ "نظری اور عملی دونوں طرح کا مفاد اس میں ہے کہ ہم الجزائری قوم کے طرز بود وباش سے بخوبی واقف ہوں۔ نظری طور پر اس لیے کہ ہم فرانسیسیوں کا یہ فرض اور حق ہے کہ ہم ان تمام قوموں کے حالات سے واقف اور باخبر ہوں جن کی حفاظت ہمارا کام ہے، اور جن کے انتظام کی ذمہ داری ہم پر آتی ہے، ہمیں اس معاملہ میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرنا چاہیے، فرانسیسی استعمار ہی نے سوشیالوجی کا علم پیش کیا، اور ہمارے مشنری لافیٹ اور چارل فیو نے امریکا میں علم الاجتماع کے مطالعاتی مراکز قائم کیے"۔

رینی مون یہ بھی لکھتے ہیں کہ "الجزائر میں ماسکرای اور ڈوٹ نے عمدہ کارنامے انجام دیے، ہماری خواہش ہے کہ علم الاجتماع اور علم احوال الانسان کے مطالعہ کے لیے ویسے ہی ادارے قائم کیے جائیں جیسے یہ امریکہ میں قائم ہیں، یا خود فرانس نے مغرب اقصیٰ میں جس طرح کے ادارے قائم کر رکھے ہیں، اس قسم کی تنظیموں کے قیام سے علمی فائدے اس طرح حاصل ہوتے ہیں کہ علم ہی قوت کے نفاذ اور حکومت کے رسوخ کا سرچشمہ ہے، علم ایک ایسا وسیلہ ہے جس پر عمل ناگزیر ہوتا ہے، ہم سے بہت سی غلطیاں اور جرائم صرف اس لیے سرزد ہوتے ہیں کہ ہم کو اپنے عائلی اور خاندانی خیر وبہبود کا علم نہیں ہوتا ہے، یہ علم اگر ہو تو بہت سی غلطیوں اور مجرمانہ

حرکتوں سے ہم احتراز کر سکتے ہیں۔" (ص ۴۳)

اس خوبصورت تمہید کے بعد یہ مستشرق الجزائر کی مسلم تہذیب اور قدیم تہذیبوں کے درمیان چند باتوں کا فرق ظاہر کرتے ہیں، اور اس کے فوراً بعد ہی یہ رائے صادر کرتے ہیں کہ "الجزائر کے قوانین اور یورپ کے قوانین میں بنیادی اختلاف ہے۔" (ص ۴۹) اسلامی عقیدہ کو وہ مقامی مذہبی معتقدات کے نام سے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان معتقدات میں جنات اور ارواح پر ایمان وغیرہ شامل ہوگیا ہے، اسی لیے وہ یعنی اسلام دین حقیقی کے مقابلہ میں ابتدائی دور کی طوطمیت یعنی جانور پرستی، شجر پرستی یا پھر ستارہ پرستی وغیرہ سے زیادہ قریب ہے، رینی مون کے نزدیک ظاہر ہے کہ دین حقیقی سے مراد دین مسیحی ہی ہے، مستشرقین کے طرز تحریر کی یہ خاص بات ہے کہ ذکر خواہ تہذیب کا ہو یا تعلیم کا، بات اسلام سے بیزاری کے جذبات تک پہونچ ہی جاتی ہے۔ ان کی تحریروں کی شتر گربگی اب علمی دنیا کے سامنے کوئی مخفی چیز نہیں ہے، مستشرق رینی مونی بھی اپنی بحث کے حدود اور دائروں کے تعین میں بے یقینی اور تذبذب کا شکار ہیں، ایک طرف تو ان کا یہ کہنا ہے کہ الجزائر میں ایسی شے کا وجود تو ہے جسے (تہذیب) کا نام دیا جاسکتا ہے، انھوں نے تہذیب کو قوسین میں لکھا ہے، مگر پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ قوسین میں بند یہ تہذیب صرف چند قبائلی اقلیتوں کے پاس ہے، یہ وہ قبائل ہیں جن کو قوم کا نام تو نہیں دیا جاسکتا مگر یہ اپنی وحدت، اپنے رسوم و رواج اور اپنے مخصوص قوانین ضرور رکھتے ہیں، ان لوگوں کی تہذیب دلچسپ ہے، اور ان ہی سے مخصوص ہے، اس تہذیب کی وجہ سے اُن لوگوں میں نئی رسمیں نہیں پھیلنے پاتی ہیں (ص ۵۰) مصنف کا یہ کنایہ ظاہر ہے کہ اسلام کی تہذیب سے عبارت ہے، اسی لیے وہ اس دلچسپ تہذیب کو قدیم قبائلی تہذیبوں کے مماثل قرار دیتے ہیں، اور اس کے بعد آخر میں وہ دل کی بات اس طرح کہتے ہیں کہ "اس بحث کا حاصل

یہ ہے کہ اسلام اور بت پرستی میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے، بلکہ اسلام بت پرستی کا تتمہ ہے" اس کے بعد وہ اس یقین کا اظہار کرتے ہیں "بحر متوسط ہمیشہ بحر یونان اور بحر لاطینی ہی رہے گا۔ اس لیے کہ نور اول اور فکر قدیم کے سوتے ابھی وہاں خشک نہیں ہوئے ہیں، اور یہ فرانس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان روشنیوں کو شمالی افریقہ میں قائم و دائم رکھنے کے لیے سخت جدوجہد کرے۔" (ص ۵۳)

رینی مونی کا یہ حرف آخر جسے انھوں نے نہایت معصومیت اور سادگی سے پیش کیا ہے، یہ اصلاً سارے مستشرقین کے مطالعہ اور تحقیق و تصنیف کا سچا اصول اور حقیقی طرز فکر ہے، اسلامی معاشروں اور تہذیبوں کے بارے میں یہ سب ہم آواز ہیں، رینی مونی بار بار اپنے مسلک موضوعیت کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ وہ ڈورکایم کے نامور ترین شاگردوں میں سے ایک ہیں، ہم کو ان دونوں کے حسن نیت یا اصل نیت پر کوئی شک نہیں، لیکن استشراق کی حقیقت یہی ہے کہ وہ اپنے اور اسلام کے درمیان ایک فصل قائم رکھنا ضروری سمجھتا ہے، اس کے موضوع اور مطالعہ کی غرض و غایت کا اگر علم رہے تو پھر مطالعہ کے نتائج سے زیادہ حیرت نہیں ہوتی، خواہ یہ نتائج حقیقتوں کو کتنا ہی مسخ کر دینے والے اور تصویر کا غلط رخ پیش کرنے والے ہی کیوں نہ ہوں۔

ان مستشرقین کی نظر میں خود علم الاجتماع، علوم استعماری (SCIENCES COLONIALES) کے اہم ابواب میں سے ایک باب ہے، کیونکہ اس کا موضوع صرف یہ ہے کہ وہ ان تہذیبوں اور معاشروں کا جائزہ لے جن پر یورپ کی اقوام حاکم و قابض ہیں، اس کے مقاصد بھی لیل و نہار کی گردش سے متاثر نہیں ہوتے، پہلے مقصد یہ تھا کہ فرانسیسی شہنشاہیت کے مفاد کی خدمت کی جائے، آج یہ فرانسیسی جمہوریت کی خدمت کر رہا ہے، یہ کہنا برحق ہے کہ علم الاجتماع کا یقینا

خواہ بظاہر دلکش نظر آئے لیکن یہ محض ایک وسیلۂ استحصال ہے، جسے صرف ایسے مقاصد کے لیے وضع کیا گیا ہے جن کا تعلق نہ علم سے ہے نہ معرفت سے، اور نہ ہی مقبوضہ قوموں کے مفاد سے اس کو دلچسپی ہے۔

ہم نے اوپر ریخی مونی کی ایک کتاب کا جائزہ لیا ہے، مگر سچائی یہ ہے کہ اس پورے عرصہ میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اس کا جائزہ لیا جائے تو چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر سارے مستشرقین آخر میں وہی نتیجہ پیش کرتے ہیں جو ریخی مونی نے پیش کیا، موضوعات میں تنوع ہوتا ہے لیکن غرض وغایت میں سب ایک نقطۂ خیال پر متفق نظر آتے ہیں، اور اسلام دشمنی ان کے تمام مطالعات و دراسات کے آخری نتیجہ اور ماحصل کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

یہ بات پوری ذمہ داری کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ حقیقی معنی میں علم الاجتماع کے ماہرین بہت کم ہیں، اس موضوع پر لکھنے والے زیادہ تر یا تو تنظیموں کے تنخواہ یاب ہیں، یا پھر فرانسیسی فوج کے عہدیدار ہیں، جن کا وظیفہ یہی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اسلام کا انکشاف کریں اور پھر خالی اوقات میں اس پر داد تحقیق دیں، ان لوگوں کی حیثیت دراصل معلومات، دستاویزات، اور اہم وغیر اہم واقعات کو جمع کرنے والوں کی طرح ہے، یہ لوگ بدسلیقگی سے ان معلومات کو جمع کر کے پیش کر دیتے ہیں، اور ان کو ایسے محققین کے تصرف میں خام مال کی حیثیت سے سونپ دیتے ہیں جو اصل سے رجوع نہیں کرتے، اور اندھے اعتماد پر اپنی تحریروں کو ان معلومات سے لبریز کر دیتے ہیں، بحث وتحقیق کا یہ طریقہ ہمیں گرچہ عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے، لیکن ایتھنوگرافی یعنی علم طبقات الانسان کے جاننے والوں کے یہاں اس وقت یہی طریقہ رائج ومقبول تھا۔

ایک مستشرق ہنری لیوی برول (HENRY LAVY BRUHL) ہیں جو ابتدائی عقلیت کے نظریہ کو پیش کرنے والے کی حیثیت سے معروف ہیں، انھوں نے اس موضوع پر دس سے زیادہ کتابیں لکھیں اور سربون یونیورسٹی میں ایک تہائی صدی تک اسی موضوع پر درس دیا، لیکن حیرت کی بات ہے کہ انھوں نے جن معاشروں پر داد تحقیق دی اور جن پر ان کو درجۂ اختصاص حاصل ہوا ان میں سے کسی ایک معاشرہ یا تہذیب کا انھوں نے خود جاکر کبھی مشاہدہ نہیں کیا، اس لیے کہ میدانی اور عملی تحقیقات مثالوں اور نظیروں کے پیش کرنے والی تحقیقات سے کہیں مختلف ہوتی ہیں، کبھی کبھی کوئی محقق یہ زحمت محض اتفاقی طور سے برداشت کرتا تھا، اس طرح پیرس کے یہ نامور مستشرقین کنج عزلت میں بیٹھ کر دور دراز ملکوں اور قوموں کی تہذیبوں کا مطالعہ کرتے تھے اور داد تحقیق دیے تھے۔

زیر بحث قوموں اور تہذیبوں کے علاقہ میں جاکر تحقیق کرنے والوں کو عینی شاہد کا درجہ حاصل ہے، مگر یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایسے محققین میں اکثر عربی زبان سے ناواقف تھے، ان کی معلومات کا دارومدار زیادہ تر ترجمانوں پر تھا، اس طرح براہ راست ان کا تعلق اور ربط اصل آبادی سے نہیں ہو پاتا تھا، ترجمانوں کو گرچہ مکمل طور پر غیر تعلیم یافتہ نہیں کہا جاسکتا، لیکن ان کی علمی صلاحیتیں بہرحال بہت محدود تھیں اور تحقیق کے رموز واسرار سے ناآشنا تھیں، ان مستشرقین میں ریخی مونی کے علاوہ جن کی کتاب کا ہم نے اوپر ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے، چارلس لوکیر (CHARLES LECOEUR) ماسکرای (MASQUERAY) برتھلون (BERTHOLON) گوٹئے (E.F. GAUTIER) وغیرہ شامل ہیں، اس سلسلہ کی آخری کڑی جان ڈوڈینو (J. DOVIGNAU) ہیں، ان لوگوں نے علم الاجتماع کو بازیچۂ اطفال بنادیا اور انھوں نے استشراق کو اتنا ہی نقصان پہونچایا جس قدر

اسلام اور عربی معاشروں کو ۔

ہم کو اس پر ذرا بھی حیرت نہیں کہ ان مستشرقین کے ورثہ کو ہم مختلف قسم کی کہانیوں ، قصوں اور بے سر و پا واقعات سے بھرا ہوا پاتے ہیں، ان کو جس طرح کی معلومات فراہم ہوئیں انھوں نے بغیر کسی احتیاط و تفتیش کے ان سب کو اپنی تحریروں میں سمو دیا، انھوں نے ان ثانوی اور غیر معیاری معلومات کے سلسلہ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ واقعہ اور مفروضہ میں فرق کرنے کے ذمہ دار بھی ہیں، البتہ ان کو ایسی تحریروں پر اپنے ان قارئین سے مدح و ستائش ملی جو اپنے قومی پندار و تفوق میں مبتلا تھے، تکبر اور تفوق کے اس احساس کو استشراق نے بہت زیادہ اہمیت دی، یورپ کو ایسی تحریروں کا انتظار رہا اور مستشرقین کی کتابوں سے اس کو اپنے احساس برتری کے لیے غذا فراہم ہوتی رہی ۔

کچھ مثالیں ایسی بھی ہیں جو حقائق حق کی صورت میں سامنے آئیں، مثلاً ایک مفکر آلین (ALAIN) نے مستشرقین کے اس علمی نقص کو محسوس کیا، انھوں نے ان کی تحریروں کے جواب میں مضمون لکھے، آلین علم الاجتماع کے ان ماہرین کا مذاق اڑاتے تھے، وہ کہتے تھے کہ یہ مستشرقین حقیقی تنقید کے سادے اور عام اصولوں سے بھی ناآشنا ہیں، اور ان کی تحریریں ان کے جہل اور علمی نقص کو واضح کرتی ہیں، انھوں نے ایک جگہ لکھا کہ " اگر میں اپنے قلم کو مخاطب کر کے یہ کہوں کہ اے میرے پیارے قلم اور اس جملہ کو علم الاجتماع کے یہ ماہرین اگر اپنی تحقیق میں شامل کرلیں تو وہ اس جملہ کو روحانیات سے منسوب کردیں گے اور یہ کہیں گے کہ میں نے اپنے قلم میں ایک چھوٹا دیوتا دیکھ لیا تھا ۔"

لیکن آلین جیسے مستشرقین کی تعداد بہت کم ہے، اکثریت ان ہی لوگوں کی ہے جو اپنے علم و قلم کے رشتہ کو دجل و مکر اور فریب کے معائب سے قائم کرتے ہیں، درحقیقت

استشراق کا میدان ان ہی کے لیے ہموار اور کشادہ ہے ۔

ان مستشرقین کی تحریروں میں ایک عیب یہ بھی ہے کہ مثالوں اور واقعات کو پیش کرتے ہیں یہ لوگ اصل کی مطابقت کا لحاظ نہیں کرتے ہیں، اسلامی معاشرہ سے وہ ایسی بہت سی باتیں منسوب کر دیتے ہیں جن کا وجود ہی اس معاشرہ میں نہیں ہے، یہ مثالیں اور واقعات دوسری تہذیبوں سے لیے جاتے ہیں اور پھر ان کو اسلامی تہذیب کے نام سے پیش کر دیا جاتا ہے، ان لوگوں کے اصول اور ان کا زاویۂ نگاہ یورپ کے معاشروں کی روشنی میں اپنا ایک رخ متعین کرتا ہے، اور پھر وہ اسی روشنی میں دوسری تہذیبوں کو دیکھنا چاہتے ہیں، اصول و مبادی کے لحاظ سے ان کا علم الاجتماع، مغربی معاشرہ اور تہذیب کے محور کے گرد ہی گردش کرتا ہے، ان ماہرین علم الاجتماع کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو، ہونا یہی چاہیے کہ علم الاجتماع کے اپنے اصول و قوانین اور آداب و شرائط ہوں، ان پر دقیق طور سے کسی تہذیب کے اثرات کا غلبہ نہیں ہونا چاہیے، مستشرقین کی اصولی غلطیوں کی نشان دہی کرتے وقت ان کی عجیب و غریب مثالیں ہمارے سامنے آئیں، مثلاً ہم نے ایسے محققین کو دیکھا جو اس راز سے واقف ہونے کے لیے بے چین ہیں کہ اسلامی معاشرہ اور ثقافت میں تھیٹر، ڈرامہ اور ناٹک کی ترقی کیوں نہیں ہوتی ؟ اسی طرح بعض ماہرین علم الاجتماع ایسے اسباب و علل کی تلاش میں سرگرداں ہیں، جن کی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں سرمایہ داری فروغ نہیں پاتی ہے، ایسے محققین جب اپنی خواہش کے مطابق کوئی وجہ تلاش نہیں کرپاتے ہیں تو پھر وہ ایسی جزئی باتوں اور ایسی بے سروپا کہانیوں کی دریافت میں مصروف ہوجاتے ہیں جن کو وہ بحیثیت علت و سبب کے پیش کرسکیں، اور پھر وہ اپنے قلم کی ساری توانائیوں کو اس طرح صرف کرتے ہیں کہ گویا معاشروں اور ثقافت کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوسکتی

جب تک کہ ان میں تھیٹروں، ڈراموں اور ناٹکوں کا وجود نہ ہو، یا جب تک اسلامی معاشرے راس المالیت اور سرمایہ داری کے فیضان سے محروم رہیں گے، اس وقت تک ان کی تہذیب وثقافت کا پایۂ اعتبار ساقط رہے گا۔

یہ اہل قلم اپنی مغربی تہذیب کا موازنہ دوسری تہذیبوں سے اس طرح کرتے ہیں کہ یہی ایک اصل کسوٹی ہے جس پر کھرے اور کھوٹے کی تمیز ممکن ہے، ان میں سے اکثر مستشرقین اپنی برتری اور تفوق کے احساس میں اس طرح سرشار رہتے ہیں کہ ان کی نظر میں دنیا کا کوئی بھی معاشرہ اور ثقافت مغربی تمدن کی ہمسری نہیں کر سکتا، یہ حضرات ہر غیر معاشرہ کو غیر منظم اور غیر معیاری ثابت کرنا ہی اپنی موضوعیت کا فرض اولین سمجھتے ہیں، دوسرے معاشروں خصوصاً اسلامی تہذیب و تمدن کے نقائص اور عیوب اس طرح بیان کیے جاتے ہیں جس سے ان معاشروں کی انسانیت ہی مشکوک ہو جاتی ہے، ایسے موقعوں پر وہ اسلامی قوموں اور تہذیبوں کا براہ راست نام لینے سے گریز کرتے ہیں، اور اسلامی قوموں کے بجائے وہ قبیلوں کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اسلامی اخلاقی قدروں کی جگہ وہ رسوم کے لفظ سے اپنے ضمیر کو مطمئن کرتے ہیں، اور حد تو یہ ہے کہ وہ عقیدۂ اسلامی کو صحیح لفظ و معنی سے محروم کر کے محض معتقدات کے لفظ سے اپنے قاری کو مغالطہ میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس طرح صاف طور پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی تحریر و تحقیق کا محور صرف مغربی معانی و مفاہیم کے دائرہ میں محدود ہے، جس میں ہر لمحہ ان کے احساس برتری اور انصاف سے ان کی چشم پوشی کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، واقعات کی تصویر کشی میں کہیں بھی ان کی موضوعیت ظاہر نہیں ہوتی، ان مستشرقین کی سرشت کو دیکھتے ہوئے شاید ان خامیوں کا احساس یا شکوہ نہ ہوتا، مگر افسوس اس وقت ہوتا ہے جب یہ سب ایسے علمی حلقوں

کی جانب سے ظہور میں آتا ہے جو علم، موضوعیت، دقیقہ رسی، سنجیدگی پر ایمان رکھتے اور شک ویقین میں فرق کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہم اوپر بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس قسم کی فضول اور لایعنی تحریروں کا ایک انبار ہمارے سامنے ہے، ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کریں گے جس کو ہم نے اسی دور سے منتخب کیا ہے، فرانس کے ایک مشہور مستشرق ریمنڈ چارلس ہیں، ان کا علمی مرتبہ اس سے متعین کیا جا سکتا ہے کہ ان کو فرانس میں اسلامی شریعت کے اسرار کا سب سے بڑا ماہر اور فقہ کی باریکیوں کا سب سے بڑا واقف اور عربی تہذیب وثقافت سے سب سے زیادہ باخبر تصور کیا جاتا ہے، انھوں نے مسلسل تیس سال تک کتابیں لکھی ہیں، یونیورسٹیوں میں ان کے لکچر ہوتے رہے، انھوں نے جج کے فرائض بھی انجام دیے اور فرانسیسی حکومت کے مشیر بھی رہے۔ ان کی ایک کتاب "الروح الاسلامیۃ" علمی حلقوں میں بہت معروف و متداول ہے۔

ہم نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ ان ہی پامال اور روایتی مضامین و خیالات کا مجموعہ ہے، جن کا اظہار صدیوں سے وقتاً فوقتاً اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کیا جاتا رہا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے قالب کے لحاظ سے زیادہ خوش سلیقہ، جاذب نظر اور دل فریب ہے، انداز بیان دلکش ہے اور غیر جانبداری اور موضوعی ہونے کا مدعی بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ فرانس کے ایک نامور اور قابل احترام پروفیسر لیا۔ گوییٹے نے اس کتاب کا شمار المکتبۃ الفلسفیۃ العالمیۃ (فلسفہ کے عالمی ذخیرۂ کتب) میں کیا ہے[1]، یہ وہ سنجیدہ ترین سلسلۂ کتب ہے جو نہایت جلیل القدر فلسفیوں، عالموں، مورخوں اور طب اور ریاضی کے ماہرین کی کتابوں کو شایع کرتا ہے۔

---

[1] عجیب بات یہ ہے کہ خود پروفیسر گوییٹے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے معمولی معلومات بھی نہیں رکھتے ہیں۔

لیکن کس درجہ حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ ایسے مستشرق کی کتاب بھی عام استشراقی جذبات سے الگ نہ ہو سکی، پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد ایسے تین الزام قاری کے ذہن میں جاگزیں ہو جاتے ہیں جو ریمنڈ چارلس نے اسلام پر لگائے ہیں، ایک تو فقہی ہے دوسرے کا فقہی تعصب سے ہے، اور تیسرا قضا و قدر کے عقیدہ سے تعلق ہے، ان تینوں باتوں کی تکرار کتاب میں اس طرح کی گئی ہے جس سے یہی باور ہوتا ہے کہ گویا اسلام میں یہی تین چیزیں بنیادی ہیں اور مسلمانوں کی پوری معاشرتی زندگی اور تہذیب و ثقافت ان ہی تین چیزوں میں محدود ہے، مصنف کی نظر میں مسلمانوں کی معاشرتی اور روزمرہ کی زندگی، فقہ کی تعلیمات اور ہدایتوں کی ایسی پابند ہے کہ اس سے مفر کی کوئی سبیل نہیں، فقہ نے زندگی کی چھوٹی اور معمولی باتوں کو بھی اتنا جامد اور پابند کر دیا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی میں کسی آزادی کا امکان نہیں ہے، اپنی باتوں اور اپنے شعور اور اپنے خیالات کی دنیا میں وہ بس وہی کر سکتے ہیں جس کی اجازت ان کو فقہ سے حاصل ہے، فقہاء اور اصحاب فکر و رائے نے اپنی تعلیمات کو معاشرہ کی عام زندگی میں اس طرح راسخ اور رائج کر دیا ہے کہ اب مسلمان معاشرہ ان کے بغیر حرکت ہی نہیں کر سکتا، فرد اور خاندان دونوں ہی اس کے شکنجے میں جکڑے ہیں، معاشرتی بود و باش ہو یا فکر و نظر کی بات ہو، اقتصادی معاملات ہوں یا سیاسی تعلقات ہوں، فقہ کا عمل دخل ہر جگہ ہے، اسی لیے فقہ ایک مسلمان اور اس کی زندگی کے درمیان ایک رکاوٹ اور حجاب بن کر رہ گئی ہے، اور اس کی زندگی قطعی غیر فطری ہو گئی ہے، اسی لیے چارلس اپنے مطالعہ کی روشنی میں کہتے ہیں کہ فقہ وجود کو سلب کرنے والی، حریت کی نفی کرنے والی اور بصیرت کو زائل کر دینے والی چیز ہے۔

چارلس کی نظر میں اسلام عملی لحاظ سے اپنے معاشرہ کو ہر قسم کی آزادی اور ارادہ و خواہش سے محروم رکھتا ہے، فقہی تعلیمات معاشرہ کو اپنے جال میں اس طرح لے لیتی ہیں کہ پھر ان سے ہٹ کر حرکت بھی نہیں کی جا سکتی ہے، مسلمان اپنی آزادی ہی نہیں انسانیت کو بھی کھو بیٹھتا ہے، اس کی حیثیت ایسے میکانکی آلہ کی سی ہوتی ہے جو صرف فقہاء کے اشاروں پر چلتا ہو، چارلس فقہ کی اس گرم بازاری کو بیان کر کے بالآخر اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ مسلمان معاشرہ اور اسلامی تہذیب میں ترقی، ایجاد اور اختراع کی صلاحیتیں باقی نہیں رہتی ہیں کیونکہ ایک آزاد و خلاق فکر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ "فقہ" ہے، وہ تمام ایسی امکانی کوششوں کو تباہ کر دیتی ہے جن کی وجہ سے معاشرہ تبدیلیوں، ایجادوں اور انکشافوں کو قبول کرتا ہے۔

"الروح الاسلامیۃ" کا ایک مکمل باب چارلس نے فقہ کی نذر کیا ہے، ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ مسلمان ایک قانونی (فقہی) مرد ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر فقہ کا مکمل جائزہ لیا جائے اور اس کے نمایاں اور بڑے مسلکوں کے علاوہ فروعی مکاتب فقہ مثلاً فقہ جعفری اور فقہ خارجی پر نظر ڈالی جائے تو یہ فقہ یورپ کی سائنس کی طرح دانشمند پر سخت گراں اور بار نظر آتی ہے، حالانکہ ہمارے علماء مستشرقین نے اس کی کثافت کو دور کرنے کی مسلسل کوششیں کی ہیں، لیکن چونکہ فقہ کا نظام قدیم اور بوسیدہ ہے اور پرانے طرز پر قائم ہے اس لیے یہ ہماری عقلیت سے بہت دور ہے، ہماری حیرت بلکہ دہشت اس لیے ہے کہ بغیر کسی فرق و امتیاز کے اور بغیر کسی حد فاصل کے حق اور شرع کے درمیان فقہ کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ (ص ۹۴ ـ ۱۹۳) اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، اور فقہ کا رشتہ اسی وحی الٰہی سے قائم ہے،

جب کہ انسان اپنے بشری معیار اور تقاضوں کے مطابق قانون چاہتا ہے، تو جب بشری قانون کو الٰہی قانون کے معیار پر پہونچا دیا جائے گا تو پھر حیرت واستعجاب کے سوا اور کیا حاصل ہوگا۔

ریمنڈ چارلس یہ بھی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا اصل قانون قرار الٰہی ہے، خدا اور انسان کا یہ مرکب قانون ایک متضاد صورت پیش کرتا ہے، الٰہیات کو انسان کے اعمال و افکار سے جوڑ دیا گیا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کی تائید ہوتی ہے تو کسی کی مخالفت، اور کسی کے بارہ میں کوئی حکم ہی نہیں ہوتا، ایک چیز کو یہ قانون جائز قرار دیتا ہے تو دوسری کو حرام، اسی طرح یہ ضابطۂ الٰہی اعمال کے نتائج اور واجبات کو بھی تقسیم کر دیتا ہے، حالت یہ ہے کہ اگر استنباط اور موازنہ کے کچھ اصول وضع نہ کر لیے جائیں تو اس ضابطہ کو سمجھنا ہی دشوار ہے، چارلس اپنے ان خیالات کے اظہار کے بعد پھر یہ کہتے ہیں کہ فقہاء کے لیے یہ کام دشوار ہی نہیں ناممکن ہے کہ وہ حقیقت کی روشنی میں مسلمانوں کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے تقاضوں کو سمجھیں، کیونکہ وہ مسائل کے استنتاج اور استدلال میں نصوص کے پابند ہیں اور نصوص کو زمانہ کے تقاضوں سے مطلب نہیں ہے (ص ۱۹۴)

آگے چل کر ریمنڈ چارلس ان ہی خیالات کو بار بار دُہراتے ہیں، لکھتے ہیں کہ یہی وہ بندشیں ہیں جنھوں نے اسلام کو یورپ کے فطری قانون کی برکتوں اور فائدوں سے محروم کر رکھا ہے، اس قانون کے بارہ میں آخر کار یہی کہنا پڑتا ہے کہ اسلام میں عدل وانصاف وہی ہے جسے اللہ کی مشیت کا نام دیا جاتا ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یورپ میں قانون کا دارومدار اخلاق پر ہے، اور اسلام میں اس کی بنیاد شریعت کے اصول ہیں (ص ۱۹۴)

(باقی)

عربی زبان وادب
میں
ہندوستانی علماء کا حصہ

از

عالی جناب سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ، چنڈی گڑھ۔

"یہ وہ خطبہ افتتاحیہ ہے جو کل ہند سمینار، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے موقع پر ۱۵ اپریل ۱۹۸۶ء کو دیا گیا تھا۔ " ع م

مندوبین کرام ومعزز خواتین وحضرات

آپ حضرات کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ہندوستانی جامعات ومدارس کے فاضل اساتذہ وعلماء کی اس برگزیدہ محفل میں آپ نے مجھے چند افتتاحی کلمات کہنے کی عزت اور سعادت بخشی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کئی اعتبار سے ہندوستان کی ممتاز اور سربرآوردہ یونیورسٹی ہے۔ یہاں بڑے نامی گرامی اساتذہ مسندِ درس پر رونق افروز رہے ہیں۔ جنھوں نے اپنے اپنے موضوعات کے میدان میں ایسے نقش قدم چھوڑے ہیں۔ جو آج بھی جگمگا رہے ہیں۔ پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی ہندوستان بھر میں اردو کے پہلے پروفیسر تھے، اور میرے صوبہ ہریانہ ہی سے اُن کا تعلق تھا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی ساری زندگی اردو زبان وادب کے لئے وقف کر دی تھی اور آج وہ "بابائے اردو" کہلاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف، میر ولی الدین، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پروفیسر ہارون خان شیروانی، ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی، یہ چند نام بے تکلف ذہن میں آجاتے ہیں،

میرے عم بزرگوار پروفیسر محمد الیاس برنی بھی اسی جامعہ میں معاشیات کے پروفیسر تھے، مگر ان کی دلچسپی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ قرآنیات کے بھی ممتاز عالم تھے، مذاہب اسلامیہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ معاشیات میں بھی کئی اعلیٰ پایہ کی کتابوں کے مترجم و مصنف تھے، اور ان کا ادبی و شعری ذوق بھی غیر معمولی تھا۔ انھوں نے اردو شاعری کا موضوعات کے اعتبار سے ایک جامع انتخاب بارہ جلدوں میں کیا تھا۔ جس کی اہمیت سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامیات اور عربی میں بھی یہاں مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی جیسے جید علماء رہے ہیں، جن کی تصانیف آج بھی ہمارے لیے چراغ راہ ہیں۔

پھر اس شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کو دیکھیے تو اسے "مدینۃ العلوم" کہنا غلط نہ ہوگا۔ کون سا علم ایسا ہے۔ جس کا پودا اس سرزمین پر برگ و بار نہیں لایا۔ اور ہندوستان کی کون سی نمایاں شخصیت ایسی ہے۔ جس کی قدردانی حیدرآباد میں نہیں ہوئی۔ دینی مدارس میں یہاں صرف مدرسہ نظامیہ کا نام لینا کافی ہے، جس کے بانی حضرت مولانا انوار اللہ خان فضیلت جنگ استاد شہریار دکن تھے۔ جنھیں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی علیہ الرحمۃ کے خلفاء میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ کتب خانوں کی طرف نظر کیجیے تو یہاں گھر گھر میں علمی جواہرات کے خزینے تھے۔ بڑے بڑے کتب خانوں میں سالار جنگ میوزیم لائبریری، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ سعیدیہ، کتب خانۂ جامعۂ عثمانیہ ایسے علمی نوادر کے ذخیرے ہیں۔ جن سے بے نیاز ہو کر علوم مشرقیہ کے کسی موضوع پر کوئی ریسرچ مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ سب امتیازات ایک طرف اور دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کی خدماتِ جلیلہ ایک طرف، اس ادارہ نے قدیم کلاسیکی نوادر کو محفوظ کر کے ایک ایسا عظیم الشان کام کیا ہے کہ اس احسان سے علمی دنیا کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ یہاں سے شائع ہونے والا سہ ماہی مجلہ

"اسلامک کلچر" کل بھی اسلامیات اور علوم مشرقیہ کا سب سے زیادہ وقیع مجلّہ تھا۔ اور آج بھی کوئی دوسرا مجلہ اس کے معیار کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ یہ وہ سرسری پس منظر ہے، جس کی روشنی میں وائس چانسلر صاحب کے دعوت نامہ کو میں نے دیکھا اور اسے اپنے لیے باعثِ فخر و مسرت سمجھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی جانب سے منعقد ہونے والے اس کل ہند سمینار کا افتتاح کروں جس میں ہندوستان بھر سے آئے ہوئے علماء اپنے فاضلانہ مقالات میں یہ جائزہ لیں گے کہ عربی زبان و ادبیات، اسلامیات اور متعلقہ موضوعات کے فروغ و ارتقا میں سرزمین ہند کے علماء کا کیا حصہ رہا ہے۔ یقیناً ایک اہم موضوع ہے اور اس کے ہر پہلو پر تفصیل اور جزرسی کے ساتھ غور ہونا چاہیے تاکہ موجودہ اور آئندہ نسلیں اپنے اسلاف کے کارناموں کی قدر و قیمت کو پہچان سکیں اور انھیں بھی اس روایت کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کی ترغیب ملے ورنہ کہیں یہ نوادرات آہستہ آہستہ یورپ اور امریکہ کی دانش گاہوں کی زینت نہ بن جائیں۔ اور اقبال کی طرح کوئی حساس قدرداں کہہ اٹھے۔ ؎

حکومت کا تو کیا رونا کہ یہ اک عارضی شے ہے
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے ہمیں چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ
غنی! روزِ سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

حضرات!

ہندوستان اور عرب دنیا کے تجارتی، تہذیبی اور علمی تعلقات بہت پرانے ہیں۔

اور ان پر خاصی داد تحقیق دی جا چکی ہے۔ میں اس تاریخ کو دہرانا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ آپ اس موضوع پر یقیناً مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ قدیم ثقافتی روابط پر علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں جو کچھ لکھ دیا ہے۔ اس پر ابھی تک کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کی آمد و رفت ہندوستان کے مغربی ساحل پر تھی۔ اور یہ تعلقات زیادہ تر تجارتی نوعیت کے تھے۔ پہلی اسلامی صدی کے آخر میں عربوں کے قدم سندھ کی سرزمین تک پہنچ گئے تھے۔ ہندوستانی پنڈت خصوصاً طب، فلسفہ اور ہیئت و نجوم کے ماہرین ہندوستان سے عرب دنیا میں جاتے تھے، بہت سی ہندوستانی تصانیف بھی وہاں پہنچ گئی تھیں، اور ان کے عربی میں تراجم بھی ہو گئے تھے۔ اس حرکت کا نقطۂ عروج عباسی خلافت کے اس اولین دور میں آیا جب برامکہ مسند وزارت پر فائز تھے، برمکیوں کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ وہ ہندوستانی الاصل تھے، اور برمک دراصل ہندی لفظ "پرمکھ" کی عربی شکل ہے، لیکن عربی و اسلامی علوم سے ہندوستان کا رابطہ خراسان اور وسط ایشیا کی راہ سے قائم ہوا۔ اس وقت تک عرب دنیا میں قرآن کریم سے متعلق موضوعات پر بہت کام ہو چکا تھا۔ حدیث کی جمع و ترتیب ہو چکی تھی۔ فقہی احکام کے لیے اصول بن چکے تھے۔ اور چار بڑے فقہی مکاتب وجود میں آ چکے تھے، یونانی فلسفہ و منطق سے تصادم کے بعد ایک نیا توازن پیدا ہو گیا تھا۔ جس نے علم العقائد اور علم الکلام کی نشو و نما کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور طب میں بھی خاصی پیش رفت ہو چکی تھی۔ تاریخ کا فن جمعِ روایات کے بعد عہد تدوین سے گذر کر حولیات (ANNALS) اور وقائع (CHRONICLES) تک پہنچ گیا تھا۔ یہ سب علمی سرمایہ ساتھ لیکر مسلمان علماء کے قافلے وسط ایشیا، خراسان، ایران، عراق و حجاز سے ہندوستان آ رہے تھے، یہاں کے

حکمرانوں کی مادری زبان ترکی تھی۔ مگر دفتری کاروبار فارسی میں ہوتا تھا۔ کیونکہ عباسی خلافت کے زمانے سے ایرانی دفتروں پر چھائے ہوئے تھے۔ اور انھوں نے انتظامی معاملات سے نپٹنے کے لئے فارسی زبان کو خاصا مالدار بنا دیا تھا۔ لیکن حکمرانوں کا اور اس زمانے کے طبقۂ اشراف کا اور عوام کا مذہب اسلام تھا۔ اس لئے تمام مذہبی امور میں عربی کی بالادستی ہر زمانے میں برقرار رہی، عوام کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے صوفیاء نے ان ہی کی زبان میں تلقین کا راستہ کھول کر ابلاغ کے خلا (COMMUNICATION GAP) کو پر کر دیا تھا۔ اس لئے مقامی زبانیں اور بولیاں بھی مالدار ہوتی رہیں، غرض یہ کہ عہد وسطیٰ کی تاریخ میں ہم اس طرح کے لسانی مسئلوں سے دوچار نہیں ہوتے جیسے آج کی مہذب دنیا کے سامنے آ رہے ہیں۔

عربی علوم کا پہلا مرکز ملتان میں قائم ہوا۔ ٹھٹھہ اور دیبل میں بھی ابتدائی علمی سرگرمیوں کے سراغ ملتے ہیں۔ غزنوی سلاطین کے عہد میں لاہور مرکز بن گیا تھا۔ اور جب غوری سلاطین نے دہلی اور آس پاس کے علاقوں کو فتح کر لیا تو دہلی کو بھی علمی حیثیت سے وہی مقام حاصل ہو گیا۔ جو بغداد یا مصر یا بخارا یا سمرقند کو حاصل تھا۔ یہاں علم کا ایسا چرچا تھا کہ خراسان، ایران، ترکی، عراق، یمن اور حجاز سے علماء یہاں کھنچے چلے آتے تھے، اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے، جیسے گجرات میں بدر دمامینی، خطیب گازرونی۔ اور عماد طارمی کے نام ملتے ہیں۔ جو شیراز و حجاز و یمن سے ہجرت کرکے آئے تھے، قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں لکھا ہے کہ عہد تغلق میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدارس تھے، لیکن علم کی رفتار ترقی بھی سیاسی انقلابات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ تاتاریوں کے فتنے نے بغداد اور اور وسط ایشیا کے علماء کو ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اور یہ فتنہ ہندوستان کی علمی و تہذیبی زندگی کے حق میں ایک نعمت بن گیا تھا۔ مگر یہاں بھی کسی ایک علاقے میں زیادہ

عرصہ تک امن و استحکام نہیں رہ سکا۔ پہلی بڑی ہجرت تو اس وقت ہوئی جب ۷۲۷ھ/۱۳۲۶ء میں محمد بن تغلق نے دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو بسایا اور ہندوستان کے مرکزی شہر دہلی سے بہت سے علماء، صوفیہ، فن کار اور صناع دکن کی طرف آگئے۔ انھوں نے یہاں کی علمی زندگی میں ایک نئی حرکت اور چہل پہل شروع کر دی۔ مگر یہ بھی ایک اور انتشار کا پیش خیمہ تھا کیونکہ دار الخلافہ پھر دہلی کو منتقل ہوا اور اس اکھاڑ پچھاڑ میں علمی کاموں کے لیے جو سکون و فراغ درکار ہے، وہ غارت ہو گیا۔ نویں صدی ہجری کے آغاز ہی میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ایک بار پھر یہاں کی بساط الٹ گئی اور علماء و صوفیہ نقل مکان پر مجبور ہو گئے۔ اس خلفشار میں حضرت گیسو دراز نے دہلی سے پہلے گجرات اور بہمنی سلطنت کے دار الخلافہ گلبرگہ کا رخ کیا تھا۔ ادھر گجرات میں مظفر شاہ نے ایک مضبوط حکومت قائم کر لی تھی جو مرکز کے غیر یقینی حالات کے مقابلہ میں بہت پر امن تھی، شاہان گجرات کی یہ حکومت ایک سو چوراسی ۱۸۴ سال تک قائم رہی اور اس مدت میں یہاں علوم مشرقیہ کو جو فروغ نصیب ہوا وہ اتنی کم مدت میں ہندوستان کے اور کسی خطہ میں میسر نہیں آیا۔ یہاں دکن میں بہمنی، عادل شاہی، برید شاہی، احمد شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں نے عربی، فارسی، اسلامیات اور خود ملکی زبان و ادب کی جو سرپرستی کی ہے، اس کی ایک طویل تاریخ ہے جس کا احاطہ اس مختصر وقت میں نہیں کیا جا سکتا۔ اتر پردیش کے مشرقی علاقے میں شاہان شرقی نے علوم مشرقیہ کی سرپرستی کی۔ قاضی شہاب دولت آبادی اور قاضی عبد المقتدر دہلوی کے پوتے مولانا ابو الفتح اور مولانا احمد بن محمد تھانیسری جیسے کتنے ہی نمایاں نام ہمیں جونپور کی تاریخ میں ملتے ہیں۔ جن کی بدولت جونپور کو "شیراز ہند" کہا جاتا تھا۔ جس طرح گجرات سے علم کی شعاعیں دکن اور مالوہ میں پھیلیں۔ اسی طرح جونپور سے یہ انوار لکھنؤ کو منتقل ہوئے جہاں

سلطنت مغلیہ کے آخری زمانہ میں مولانا نظام الدین سہالوی نے معقولات کا وہ مدرسہ قائم کیا جسے فرنگی محل کہا جاتا ہے۔ اور ان مدارس میں پڑھانے کے لیے ایک ایسا جامع نصاب تیار کیا جو آج بھی ان کے نام سے منسوب ہو کر درس نظامی کہلاتا ہے ہمارے علماء نے اس کو بھی جامد بنا دیا۔ اگر وقت اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہ کر وہ اس نصاب پر نظر ثانی کرتے رہتے تو یہ ہماری اس زمانہ کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا۔ اور اس عہد کے چیلنجوں کا جواب بھی دے سکتا تھا۔ کسی حد تک ندوۃ العلماء نے اس نصاب میں کچھ رد و بدل کیا ہے، ورنہ روایتی مدارس میں آج بھی بطلیموس کا نظام ہیئت پڑھایا جاتا ہے۔ اور منطق کی اُن کتابوں کا درس دیا جاتا ہے۔ جن کی حیثیت اب محض آثار قدیمہ کی رہ گئی ہے۔

ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی کیا خدمت ہوئی ہے۔ اس کا اگر عہد بہ عہد جائزہ لیا جائے تو ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔ ع سفینہ چاہیے۔ اس بحر بیکراں کے لیے غزنوی، غوری، غلامان، خلجی، تغلق، سید، لودی اور مغل خاندان کے حکمرانوں سے لے کر آج آزاد ہندوستان کے سیکولر نظام زندگی تک ہر دور اور ہر علاقہ میں اس کی تاریخ تلاش کی جا سکتی ہے۔ وقت کی ضرورت اور رجحانات کے اعتبار سے یہ فرق ضرور ہو گا کہ کہیں کسی موضوع پر زور ہو گا، کہیں کسی پر، لیکن اس روایت کے تسلسل میں فرق نہیں آیا ہے۔ آخر عہد مغلیہ میں ہندوستان میں چھوٹے چھوٹے قصبات میں علوم و ثقافت کے مرکز قائم ہو گئے تھے، اور یہاں بیٹھ کر علماء، خاموشی اور بے لوثی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت کرتے تھے، ان مراکز کی سرسری فہرست بھی خاصی طویل ہو گی۔ اور اس میں امروہہ، بلگرام، ہرگام، جائس، نیوتنی، گوپامئو، امیٹھی، سندیلہ کاکوری، خیرآباد، ٹونک، رام پور،

بھوپال، بیدر، بیجا پور، گلبرگہ، بُرہان پور، اورنگ آباد، مرشد آباد، لکھنوتی اور ایسے دوسرے درجنوں نام سامنے آئیں گے جن میں سے ہر علاقے کی مستقل تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔

معزز مندوبین اور اساتذۂ کرام!

یہ تو ہندستان میں علوم عربیہ کے مراکز کا ایک بہت ہی سرسری خاکہ ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان مرکزوں میں کن موضوعات پر کیا کام ہوئے ہیں۔ اسلامی دنیا میں علوم کو دو خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی منقولات اور معقولات۔ کچھ علوم ایسے ہیں جو روایت سے نسلوں کو منتقل ہوئے۔ ان میں تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ و سیرت بھی آجاتے ہیں۔ اور دوسری شق کے علوم فکر انسانی کے زائیدہ ہیں۔ جنھیں عقل اور منطقی تاویل و تحقیق سے مدون کیا گیا ہے۔ ان میں فلسفہ، منطق، طب، ریاضی وغیرہ آتے ہیں۔ بعض علوم یا ان کی شاخوں میں منقول و معقول دونوں ایک خاص تناسب سے حصہ لیتے ہیں۔ ہندوستانی علما نے ان کی ہر شاخ میں اپنی ذہانتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہاں عربی زبان کی لغت اور صرف و نحو پر بھی کام ہوا ہے۔ لغت میں رضی الدین حسن صغانی کی نہایت ضخیم کتاب "العُبَاب الزّاخر" بیس جلدوں میں صرف ب × ك × م = بکم تک پہنچی تھی۔ یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتی تو ۵۰۰ جلدوں سے کم میں نہ سماتی۔ یہ ساتویں صدی ہجری میں مرتب ہوئی۔ اور بعد کو مرتب ہونے والے تمام اہم لغات کا ماخذ بنی رہی ہے۔ اب اس کو جدید ترتیب کے ساتھ بغداد میں چھاپا جا رہا ہے۔ رضی الدین صغانی ہندوستانی تھے، اور بقول حضرت خواجہ نظام الدین اولیا بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں سے حجاز، یمن، عراق وغیرہ کا سفر کیا اور وہاں کے علمی حلقوں میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ حتیٰ کہ خلیفۂ بغداد کی جانب سے سفیر بنا کر سلطنت دہلی کے دربار میں بھیجے گئے۔ ان کی تصانیف دو درجن سے بھی زیادہ ہیں۔ جن میں سے ابھی دو چار ہی چھپی ہیں۔ ان کا ایک زندۂ جاوید کارنامہ حدیث نبوی کا مجموعہ "مشارق الانوار" ہے۔ جو صدیوں تک ہمارے مدارس میں پڑھائی گئی ہے۔ اس کی متعدد شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔

حدیث کی دوسری اہم کتاب جو ہندوستان میں تصنیف ہوئی "کنز العمال" ہے جس کے مرتب شیخ علاء الدین علی متقی برہان پوری ہیں یہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے۔ فن حدیث میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ ولی اللہ دہلوی، نواب صدیق حسن خاں، حضرت عبداللہ شاہ نقشبندی اور ہمارے زمانے میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، یہ چند نام بغیر کسی اہتمام کے لکھے ہیں۔ ان کی خدمات کسی طرح علمائے خطۂ عرب سے کم نہیں ہیں۔

لغت میں ایک اور کارنامہ "تاج العروس شرح قاموس" حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شاگرد اور قصبۂ بلگرام کے باشندے سید مرتضیٰ بلگرامی کا ہے۔ انھیں عام طور سے مرتضیٰ زبیدی کہا جاتا ہے۔ اور عرب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ زبید یمن کے رہنے والے تھے، مگر فی الواقع وہ ہندوستانی تھے۔ یہاں سے ہجرت کر کے یمن اور پھر حجاز گئے۔ وہاں سے مصر پہنچے اور وہاں ان کی بہت قدر ہوئی۔ وہیں انتقال کیا۔ ان کی بہت سی کتابیں چھپی ہیں، اور بہت سی ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ہندوستان کے لئے یہ فخر کافی ہے کہ اس کے ایک باشندے کو زبان و لغت کے معاملہ میں عرب دنیا میں بھی سند مانا جاتا ہے۔ ہندی علماء کا ایک اور قابل ذکر کارنامہ "کشاف اصطلاحات الفنون" ہے، اس میں مختلف علوم کی

اصطلاحوں کی تشریح کی گئی ہے۔ اور یہ علماء کے لیے ایک بہترین حوالے کی کتاب ہے اس کا مؤلف بھی ایک ہندی قاضی محمد اعلیٰ تھانوی ہے۔ جس کا مزار تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ہے۔

فقہ اسلامی میں بھی ہندی علماء نے بہت سی کلاسیکی کتابوں کی شرحیں لکھی ہیں۔ اور فتاویٰ کی بھی متعدد جلدیں مرتب ہوئی ہیں جن میں سے ایک قدیم مجموعہ فتاویٰ تاتارخانیہ ابھی وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند کے تعاون سے شائع ہوا ہے، اسے قاضی سجاد حسین صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ دوسرا موضوع تصوف وسلوک ہے۔ اس میں بھی متعدد کتابیں عربی میں لکھی گئیں۔ میں صرف حضرت گیسو دراز کی "شرح عوارف" کا ذکر کروں گا جس کا قلمی نسخہ ٹونک کے کتب خانہ میں ہے۔ اور جسے غالباً عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی ہی میں مرتب ومدون کیا جارہا ہے۔

حضرات!

یہ تو علوم معقول ومنقول کی طرف ہلکے سے اشارے تھے، ظاہر ہے کہ ان کی تفسیر اور تشریح کرنے والے فاضلانہ مقالات آپ آنے والے چار دنوں میں سنیں گے۔ کاش! میں بھی ان سب اجلاسوں میں شریک ہوکر اپنی علمی تشنگی کو فرو کرنے کا موقع پاسکتا، لیکن اب آخر میں تھوڑا سا ذکر شعر وادب کا بھی ہوجائے۔ عربی میں شعر کہنے والے یہاں ہر دور میں ہوئے ہیں۔ امیر خسرو بھی عربی میں شعر موزوں کرتے تھے۔ حضرت چراغ دہلی کے خلیفہ قاضی عبدالمقتدر دہلوی کا قصیدۂ "لامیہ" ایک معروف قصیدہ ہے، لیکن علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی شخصیت ایسی ہے کہ ان کے عربی میں ایک چھوڑ سات دیوان ہیں جنھیں وہ سبعہ سیارہ کہتے ہیں۔ ان دواوین کا صرف انتخاب ہی چھپا ہے۔ ان کے سوا ہندوستان میں عربی کا اور کوئی صاحب دیوان شاعر نہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری

کا نام لے سکتے ہیں، مگر ان کا شعری مجموعہ بھی دیوان کے طور پر مرتب نہیں ہوا ہے علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کا ایک اور حیرت انگیز کارنامہ "شفاء العلیل" ہے جس کا قلمی نسخہ یہیں حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ابوالطیب المتنبی عربی کا کتنا عظیم شاعر ہے، اس کے کلام پر بعض متقدمین نے نحو اور قواعد کی پابندیوں سے انحراف کرنے کا الزام لگایا ہے، آزاد بلگرامی نے عملاً اس کے ایسے سقیم اشعار پر اصلاح کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اگر المتنبی اس شعر کو یوں کہتا تو غلطی سے محفوظ رہتا۔ ایک ہندوستانی کی یہ جرأت رندانہ قابل داد ہے۔ اور تقریباً سب مواقع پر آزاد بلگرامی کی رائے قرینِ انصاف ہے۔ یہ قیمتی مخطوطہ حال ہی میں ہمارے دوست پروفیسر نثار احمد فاروقی نے حواشی کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے۔ اور اسے عربی مجلہ "ثقافۃ الہند" میں چھاپا ہے۔ جس کے وہ ایڈیٹر بھی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی خدمات جلیلہ کا تذکرہ نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ یہ دونوں بزرگ عربی کے شاعر بھی تھے، مگر ان کی خدمات کا دائرہ عملاً ایسا وسیع ہوا ہے کہ برصغیر پاک وہند وبنگلہ دیش کے عربی دینی مدارس کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح اسی خانوادہ سے جاکر متصل ہوتا ہے۔

عہدِ حاضر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب قبلہ کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ان کا اسلامی دنیا میں ایک ممتاز اور اعلیٰ مقام ہے، اسی سلسلہ میں یہاں مولانا محمد باقر آگاہ مدراسی کا بھی تذکرہ کروں گا۔ جو صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، اور جنھوں نے عربی نظم ونثر میں یکساں قدرت کے ساتھ لکھا ہے۔ عربی علوم پر کرناٹک، اراکاٹ، کیرلا، آندھرا اور مہاراشٹر سبھی علاقوں میں بہت وقیع کام ہوا ہے۔ ارکاٹ کی حد تک تو پروفیسر محمد یوسف کوکن صاحب نے انگریزی میں ایک مبسوط کتاب لکھ کر بہت سے کاموں کا احاطہ کرلیا ہے۔

مگر اس کی سخت ضرورت ہے، کہ ہر علاقہ میں ہونے والے کاموں کا، تفصیلی تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ ابھی تو کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں موجود عربی مخطوطات کی بھی کوئی جامع فہرست نہیں بن سکی ہے۔

حضرات!

حکومت ہند نے عربی اور فارسی کو کلاسیکی زبانوں کے زمرہ میں رکھا ہے۔ اور ان زبانوں کی ترقی سے حکومت کو دلچسپی ہے۔ ہمارے ملک کی تقریباً بیس جامعات میں عربی کا شعبہ موجود ہے۔ کالجوں کی تعداد تو یقیناً کئی درجن ہوگی۔ پھر اس ملک میں ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ نظامیہ حیدرآباد اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر جیسے بڑے بڑے مدارس بھی کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں ایک درجن سے زائد اخبار و مجلات عربی میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں عربی مجلہ "ثقافۃ الہند" بھی شامل ہے۔ جسے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں آج سے ۲۵ سال قبل شروع کرایا تھا۔ یہ ہندوستانی سفارت خانوں کے ذریعہ تمام عالم اسلام میں جاتا ہے۔ اور آج کل اس کو پروفیسر نثار احمد فاروقی ایڈٹ کر رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے دن میں اور رات کو دو بار نشریات ہوتی ہیں۔ جن کا وقت حال ہی میں بڑھا بھی دیا گیا ہے، ریڈیو پر عربی کا پورا یونٹ قائم ہے، وزارت تعلیم عربی مدارس کو معقول مالی امداد بھی دیتی ہے۔ اور مدارس میں رہ کر جو اساتذہ یا طلبہ کسی عربی مخطوط کو ایڈٹ کرنا چاہیں۔ یا کسی خاص موضوع پر ریسرچ کرنا چاہیں۔ انھیں تین سو روپیہ ماہوار کا علمی وظیفہ دو سال تک کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس سے مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ عربی اور فارسی کے دو دو ممتاز عالموں کو حکومت ہر سال

سند امتیاز دیتی ہے، جو صدر جمہوریہ اپنے مبارک ہاتھوں سے عنایت فرماتے ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ اس سال یہ سند امتیاز پانے والوں میں اسی یونیورسٹی کے سابق پروفیسر مولانا عبدالستار خان صاحب بھی ہیں۔ اس کے لیے [illegible] عثمانیہ یونیورسٹی کا شعبۂ عربی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

حضرات!

اس سمینار کا موضوع اتنا وسیع ہے۔ اور وقت اتنا محدود، میرا دائرۂ علم اس سے بھی زیادہ تنگ۔ حق ادا ہو تو کیسے؟ بہرحال مجھے رسم افتتاح ادا کرنے کے لیے رسمی طور پر کچھ نہ کچھ کہنا تھا۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ بقول شاعر۔ ؎

جنوں کی منزلیں اتنی کٹھن، ہیں مبتدی ایسا
کہ اب تک ہاتھ رکھنا بھی نہیں آتا گریباں پر

آپ حضرات کے درمیان یہ وقت گزار کر مجھے دلی مسرت ہوئی ہے۔ میں شعبۂ عربی کو اس کامیاب علمی اجتماع کے لیے مبارک باد دیتے ہوئے اس کے افتتاح کا اعلان کرتا ہوں۔

دروس الادب حصہ اول و دوم

دروس الادب کے نام سے عربی ابتدائی طالب علموں کے لیے عربی کی ریڈریں، جو اس طرح مرتب کی گئی ہیں، کہ طالب علم کو عربی لکھنے اور بولنے کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے، جو درحقیقت عربی پڑھنے کا اصل مقصد ہے، یہ عربی کے اکثر مدارس کے نصاب میں شروع سے شامل ہیں۔

مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ مرحوم۔ قیمت علی الترتیب۔ ۳ و ۵ روپے۔
(منیجر)

ابلیس و بشر اور اقبال

از

ڈاکٹر محمد منصور عالم شعبۂ اردو و فارسی. مگدھ یونیورسٹی

عشق اندر جستجو افتاد و آدم حاصل است   جلوۂ او آشکار از پردۂ آب و گل است
(زبور عجم - حصّہ دوم)

اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کی شاعری کا بنیادی محرک ابلیس ہے، تو تعجب کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ نہ ہوتا تو اقبال کو بازیابی بشر کی فکر نہ ہوتی۔ اور خودی، عشق، حرکت و عمل، مسئلہ خیر و شر، جبر و اختیار، وصل و فراق، عقل و عشق وغیرہ کے اسرار و رموز بھی فاش نہ ہوتے. اقبال کی شاعری ابلیس کے توسل سے بشر کی تلاش ہے.

ارشاد باری تعالےٰ ہے:۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ	اور وہ ہے جس نے کیا تمکو جانشین زمین کا
وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ	اور بلند کیا بعض تمھارے کو اوپر بعض کے درجے میں۔
لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ "(الانعام)"	تاکہ آزماوے تم کو بیچ اس چیز کے کہ دیا ہے تم کو[1]

یہ درجہ ایمان و عمل صالح اور حق و صبر کے ساتھ زندگی گذارنے سے بلند ہوتا ہے۔

اور اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ آیندہ بھی خلیفہ بناتا رہے گا۔

---

[1] قرآن مجید کی آیتوں کا ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کے ترجمہ قرآن سے منقول ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	وعدہ کیا اللہ نے ان لوگوں سے جو کہ ایمان لائے بیچ تم میں سے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ	اور کام کئے اچھے البتہ خلیفہ کریگا انکو بیچ زمین کے
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	جیسا کہ خلیفہ کیا تھا ان لوگوں کو کہ پہلے ان سے
(النور۔ آیت۔ ۵۵)	تھے۔

اس دنیا میں انسان کا یہی منتہائے عروج ہے کہ وہ اللہ کا خلیفہ اور الناس کا امام و پیشوا بن جائے۔ پھر اسے کسی امر کا خوف و غم نہیں۔ ورنہ انسان تو خسارے میں ہے. کیونکہ وہ ہمیشہ ابلیس کے نرغے میں ہے۔ خواہ اس کا تعلق جس قوم و ملت سے بھی ہو۔

انسان کا خلیفۃ الارض بنایا جانا خلافِ رضائے انسان نہیں۔ قرآن کہتا ہے:۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى	تحقیق روبرو کیا تھا ہم نے امانت کو
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ	اوپر آسمانوں کے اور زمین کے اور
فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ	پہاڑوں کے، پس انکار کیا سب نے یہ کہ
اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	اٹھا دیں اس کو اور ڈر گئے۔ اس سے
نْسَانُ ط (الاحزاب - ۷۲)	اور اٹھا لیا انسان نے۔

"یہ امانت" احکام خداوندی کی بجا آوری اور اوامر و نواہی کے نفاذ کی ذمہ داری یعنی نیابت الٰہی تھی۔ اسے زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے رکھا گیا۔ مگر انھوں نے اپنے اندر تابِ قبولیت نہ پائی۔ انسان نے یہ حوصلہ دکھایا کہ اس بوجھ کو اٹھا لیا، حافظ شیرازی کہتے ہیں:۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید   قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

سوال قرعہ اندازی کا نہیں ہے۔ یہ تو ایک شاعرانہ انداز بیان ہے حقیقت

یہ ہے کہ انسان نے اس بارِ امانت کو دیدہ و دانستہ اور برضا و رغبت اٹھایا ہے۔ تو اسے اس کا صلہ بھی ملا۔ وہ اشرف المخلوقات ثابت ہوگیا۔ یہ ارض و بحر و جبال اور سموات و ثابت و سیار اس کے مسخر کر دیے گئے۔ امامتِ عالم کی اہلیت اسے عطا کر دی گئی۔ اور صرف اسے ہی عطا کی گئی۔ مبارکباد! یہ کیسا اچھا اور عظیم الشان صلہ ہے!! اس اعزاز کے باعث فرشتے۔ مخلوق معصوم و مقربین خدا۔ بھی اس کی جنبشِ نظر کے منتظر رہنے لگے۔

پھر یہ کیا ہو گیا کہ خلیفہ کی آنکھوں میں مجبوری اور یاس دکھنے لگی۔ خلیفہ اور مجبور؟ وہ مفلس ہو سکتا ہے۔ اس کے لباسِ جسم پر پیوند ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ اپنے پیراہنِ فکر میں احساسِ مجبوری کے پیوند نہیں لگا سکتا۔ ایسا کب ہو سکتا ہے۔ جب انسان اپنی ذمہ داریاں بھول جائے۔ اور بے حسی اور بے عملی اختیار کر لے۔ سو، ایسا ہی ہو گیا۔ اور ہوا تو انسان نے اپنی آنکھوں اپنا حال بھی دیکھ لیا۔ اس کے مزاج میں خرابیاں پیدا ہونے لگیں۔ وہ اپنے اعلیٰ اور بلند ترین مقام سے گرنے لگا، گرتا گیا۔ اتنا گر گیا کہ مزید پستی کا تصور ممکن نہیں۔

إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ تحقیق وہ تھا بے باک نادان۔
(الاحزاب - ۷۲)

کوئی ذمہ داری قبول کرنا ظلم اور جہالت کی بات نہیں۔ مگر نا اہلوں کے لیے، انسان نا اہل تو نہیں تھا۔ ہاں اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کر کے اس نے نا اہلی کا ثبوت دیا۔ انسان جب اپنے فرائض بھول جاتا ہے۔ بھول چوک نہیں۔ دانستہ بھول جاتا ہے۔ اور احساس جواب دہی سے بے نیاز و بے پروا ہو جاتا ہے۔ تو لازمی طور پر پستی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ وہ پستی جہل کی علامت اور ظلم کی بنا ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں انجام انسان صیدِ ابلیس ہوتا ہے۔ اور یہ انجام ہماری نگاہوں کے

سامنے ہے، انسان، جسے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونا تھا، کتنی آسانی سے ابلیس کی زد میں آگیا!

اس سانحے کا اقبال پر گہرا اثر ہے۔ وہ انسانوں کو ابلیسی نظام سے آگاہ کرتے ہیں۔ نہایت خلوص و ہمدردی سے اس نظام کا توڑ بھی بتاتے ہیں۔ اور انسانوں کو از سرِ نو اس بلند ترین مقام پر جو ان کی آفرینش کا مدعا ہے۔ فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہمارے اردگرد، ہر طرف، ابلیسی نظام مستحکم تر نظر آتا ہے۔ سیاست ہے تو دین سے الگ ہو کر اشتراکیت و سامراجیت کی کشمکش ہے۔ معاشرت کیا ہے۔ نسلی امتیاز اور روایات و خرافات کی جلوہ گاہ ہے۔ مذہب کی ضرورت کیا ہے۔ اخلاق کے خود ساختہ ضابطے کافی ہیں۔ جو کچھ ہے دنیا کی زندگی ہے۔ اسے متاع الغرور سمجھ کر ذلیل و خوار نہ کیا جائے۔ شرفِ انسانی آرام طلبی۔ عیش کوشی اور بیگانہ یوم فردا رہنے کے سوا اور کیا ہے۔ خودی اور غیرت بھلا کیا شئے ہے عشق کو حوصلہ درکار نہیں۔ بوالہوسی کی ہمت جوان ہو! عمل کو توفیقِ خرام کس واسطے؟ کہ انسان مختار کہاں؟ وہ تو مجبورِ محض ہے! یہ اور اسی طرح کے حالات و خیالات ہیں آج کا انسان گھرا ہوا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ ہماری سمتِ فکر بدل گئی ہے۔ صحیح ڈھنگ سے عمل کرنا اسی وقت ممکن ہے۔ جب صحیح ڈھنگ سے سوچنا نصیب ہو۔ جب ہماری فکر ہی دو نمبر کی ہو گئی ہے۔ تو اعمال کیوں نہ متاثر ہوں گے۔ حالانکہ سوچنے والوں کے لیے ایسی صورت حال میں چوکنا اور ہوشیار ہونے کے واضح اشارے موجود ہیں۔ چشمۂ آفتاب روز ابلتا ہے۔ روز ہی "خون" کی ندیاں رواں ہوتی ہیں۔ ہر رات مظلوموں کے آنسوؤں سے بھیگتی ہے۔ اور ہم ہر لمحہ شکستِ انسانیت کے مناظر دیکھتے ہیں۔ کیا یہ صورت حال نہیں؟ اور اسے بدلنے کی سعی کرنا ہمارا فرض نہیں؟ - اقبال کی شاعری ہمیں اسی تقاضے کی طرف متوجہ

کرتی ہے۔

اقبال انسانیت کی معراج اور بالادستی چاہتے ہیں۔ انسانیت نشو و نما کیسے پا سکتی ہے۔ اور موجودہ مہلک حالات کیونکر ختم ہو سکتے ہیں۔ یہی مرکز فکر ہے یا الفاظ بدل کر کہیے کہ انسانیت کی ترتیب و ترقی کن خطوط پر ممکن ہے اور ہمارے سامنے اس کا مثالی نمونہ کون اور کیسا ہوگا۔ اقبال کہتے ہیں۔ کہ وہ "الاسلام" کا پابند "مومن" ہوگا۔ اور اپنے اندر "بشر" کے خواص رکھے گا۔ "بشر"؟ ہاں! اقبال نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں آدم۔ آدمی، انسان۔ مومن، مسلم، مسلمان جیسے لفظوں کے سہارے مخلوق اعظم کی جن اعلیٰ ترین صفتوں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ وہ در اصل "بشر" کی ہی صفات ہیں۔ یہاں ایک امر کی وضاحت ضروری ہے۔ عبد الکریم الجیلی نے "الانسان الکامل" کی ترکیب استعمال کی تھی۔ مداحین اقبال نے (ان میں یہ ناچیز بھی ہے۔) اسی کی روشنی میں اقبال کی شاعری میں "انسان کامل" کے تصور کا عکس دیکھا۔ کیونکہ خود اقبال نے الجیلی سے کافی کسبِ فیض کیا ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ اقبال نے بجنسہٖ یہ ترکیب کہیں استعمال کی ہے۔ البتہ "مرد مومن" "مرد مسلمان" "مرد پختہ تر" "مرد عارف" "مرد محرم" وغیرہ مرکبات انھوں نے جابجا استعمال کیے ہیں ع نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں ع گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا وغیرہ۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان مرکبات کو اس طرح کام میں لایا گیا ہے۔ کہ ذہن فوراً "انسان کامل" کی طرف ہی منتقل ہوتا ہے۔ اور یہی تاثر اقبال کے مافی الضمیر میں بھی رہا ہے۔

در اصل اقبال کے نزدیک "مرد کامل" کا تصور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور ہے۔

نوعِ انساں را پیام آخریں　حاملِ او رحمۃً للعالمیںؐ
(اسرار خودی)

یا اس عظیم ترین اور بے نظیر انسانی وجود کو "بشر" کہہ رہا ہوں۔ مگر اس معنی میں قطعی نہیں جس معنی میں ہم ایک دوسرے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تک میری یادداشت فی الحال کام کر رہی ہے "قرآن مجید" میں انبیاے کرام کے لیے بطور معرفہ "الانسان" کا لفظ نہیں آیا۔ ہاں، رجال یا رجل کے الفاظ آئے ہیں۔ اور بشر، بیشتر مقامات پر مستعمل ہوا ہے، اور غیر انبیا، بالخصوص عام انسانوں کے لیے نیز۔ جہاں انسانی کمزوریوں کا ذکر مقصود ہے۔ وہاں لفظ "انسان" ہی استعمال ہوا ہے۔ اسی وجہ سے میرے نزدیک انسان، اور "بشر" میں معنوی فرقِ مراتب ہے۔ "وہ ہماری ہی طرح بشر ہے" یا "ہم اس کی طرح بشر ہیں" کی حقیقت یہ ہے کہ انسانی صفات ہمارے اور اس کے درمیان قدرے مشترک ہیں، لیکن ہم اتنے کمزور واقع ہوئے ہیں۔ کہ ان صفات کو بہ معیار اعلیٰ برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ ہر انسان کے اندر وہ مضبوطی آجائے۔ جس سے وہ صفات بشر کو اپنا کر ان پر قائم ہو جائے۔ یہ "شاہین"، "لالہ"، "قلندر"، "فقیر"، "درویش"، "مرد حر"، "مومن"، "مسلم"، "مسلمان"، "مرد سپاہی" وغیرہ جیسے الفاظ کے ذریعے جو خیالات انھوں نے پیش کیے ہیں، وہ واقعتاً صفاتِ محمدیؐ کی تجدید کے لیے ہیں۔

در جہاں زی چوں رسول انس و جاں　تا چو او باشی قبول انس و جاں
(حلاج - جاوید نامہ)

گرچہ یہ الفاظ "بشر" کے متبادل نہیں کہے جا سکتے۔ مگر اقبال کے ہاں یہ محض لغوی مفہوم رکھنے والے الفاظ نہیں رہے، اصطلاح بن گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جانے پہچانے پرانے الفاظ نئے مفاہیم ہیں۔ "بشریت" کی علامت ہیں۔ ان سے اقبال کے تصور بشر کی وضاحت ہوتی ہے۔ گو لفظ "بشر" بھی کم استعمال ہوا ہے۔ انسان کی معراج و تکمیل یہ ہے کہ وہ بشریت کا حامل ہو جائے۔ اس کو یوں بھی کہیے کہ وہ مزاجِ

محمدؐ کو اپنالے۔ تو پھر، کیا زمین، کیا مہر و مہ، کیا آسمان تو بتو، سب اس کی زد میں ہیں۔ ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

(بالِ جبریل۔ غزلوں کا دوسرا سلسلہ غزل ۳۱)

اور لوگوں کی طرح میں بھی سوچتا رہا ہوں کہ اقبال نے بار بار مسلمانوں کو کیوں مخاطب کیا۔ اور پیرویِ آئینِ پیغمبرؐ پر کیوں اتنے نازاں ہوئے؟ کیا اس وجہ سے ان کی شاعری محدود ہو کر مجروح نہیں ہوئی؟ عظیم شاعری تو آفاقی اور دائمی ہوتی ہے۔ اسے ہر زمانہ، ہر خطہ اور ہر حساس ذہن قبول کر لیتا ہے۔ کیا اقبال کی شاعری میں اس قبولیت کے آثار ہیں؟ میرا خیال ہے کہ بے سوچے سمجھے اس سوال کا جواب نفی میں دینا مناسب نہ ہوگا۔ اور یہ سوال تفصیل طلب بھی ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مگر یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہر زبان کی عظیم شاعری میں مذہبی عناصر رہے ہیں۔ اور دنیا کا ہر بڑا شاعر اپنے مذہب کو پیش کرتا رہا ہے۔ مگر اس مذہب کی وجہ سے اس کی شاعری کبھی محدود نہیں سمجھی گئی۔ اس لیے اقبال کی شاعری بھی محدود نہیں سمجھی جائے گی۔ اور نہ یہ کہا جائے گا، کہ اسلام کی وجہ سے وہ مجروح ہو گئی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اقبال کو غم صرف زوالِ مومن کا نہیں۔ حقیقتاً غم زوالِ آدمِ خاکی کا ہے۔ ؏ زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا!
(بالِ جبریل۔ غزل کا حصہ اول ۲)

اُف! یہ دیکھو! انسان کس طرح ابلیسی شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ اور انسانیت کی رگیں تن تن کر کیسے ٹوٹ رہی ہیں!! یہ منظر قابلِ برداشت ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا اس صورتِ حال سے انسان نکل سکتا ہے؟ کیوں نہیں؟ تو پھر کون سا امر مانع ہے؟ شاید زیادہ تر لوگ ایسے ہیں، جنھیں ابلیس زدہ ہونے کا احساس نہیں یا ہے تو کچھ پروا نہیں۔ یا پھر، انھیں نجات کی کوئی مناسب ترین صورت نظر نہیں آتی۔ اقبال یہی کرتے ہیں کہ

ان انسانوں کو ابلیس زدہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ انھیں غور و فکر پر آمادہ کرتے ہیں اور نجات کا جو واحد راستہ ہے۔ "الاسلام" اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بے پیرویِ اسلام زوالِ آدم یقینی ہے۔ اور پیرویِ اسلام ضامنِ عروجِ آدم ہے۔

یہ گفتگو کسی مذہبی تعصب کی بنا پر ہرگز نہیں۔ آپ کے پاس ذرائع معلومات کی کمی نہیں ہے۔ آپ قوتِ مشاہدہ اور تابِ تجزیہ بھی رکھتے ہیں۔ قوانینِ فطرت، ادیانِ عالم اور مختلف نظریات و نظامہائے حیات پر جو متعدد اور مستند کتابیں لکھی گئی ہیں، آپ نے ان کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ عقلی اور استدلالی طور پر ہی اخذ نتائج کیجیے۔ آپ کی روشن دماغی اور راستی فکری صرف ایک حقیقت تک آپ کو لے جائے گی۔ وہ یہ کہ اللہ کے نزدیک دین، صرف 'اسلام' ہے:۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ تحقیق دین نزدیک اللہ کے اسلام
الْاِسْلَامُ۔ (آل عمران۔ آیت ۱۹) ہے۔

اور جو اسلام کا پابند ہوا وہی کامیاب ہے۔ اور دنیا کی تاریخ نے اس کی مثالیں بھی فراہم کر دی ہیں۔

شاید آپ کہیں کہ دنیا میں مسلمان تو آج بھی ہیں۔ اور اربوں کی تعداد میں ہیں۔ پھر وہ کیوں ناکام و نامراد اور مایوس و پریشان حال ہیں؟ اور کیوں اس اللہ کی شکایتیں کرتے پھرتے ہیں جس کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۰ میں آپ کی توجہ "ام الکتاب" کی ایک خاص آیت کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا اور یہ کسی جانبداری کی وجہ سے نہیں۔ ایک آفاقی اور دائمی صداقت پر اس یقین کی بدولت جو مجھے حاصل ہے ام الکتاب کہتی ہے:۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا	(البقرہ پ ۲ ع ۲۵)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ داخل ہو بیچ
فِى السِّلْمِ كَافَّةً وَّلَا		اسلام کے سارے۔ اور مت پیروی
تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ		کرو قدموں شیطان کی تحقیق وہ
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ		واسطے تمہارے دشمن ہے ظاہر،

قابل غور امر یہ ہے کہ یہاں دوسروں کو نہیں۔ ایمان والوں کو ہی اسلام میں پوری طرح داخل ہونے کو کہا جا رہا ہے۔ تو، جب تک وہ مسلم کامل نہیں بنتے، کامیابی انکی طرف کیسے متوجہ ہو سکتی ہے۔ ایسے مسلمان حاملِ اسلام نہیں۔ ان ہی کو نمونہ بنا کر اسلام کو سمجھنا ناقابل تلافی نقصان پہنچانے والی غلطی ہوگی۔ البتہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اسلام اب نیم مردہ اور بے اثر ہو گیا ہے، یہی احساس اقبال کو بھی تھا۔ ایک ناگزیر شئے کیوں ہمارے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ پھر ہمارے پاس ہماری بہتری اور ترقی کے لیے رہے گا ہی کیا۔ چنانچہ وہ حقیقت گم گشتہ کی بازیافت کرتے ہیں۔ اس میں کسی ایک گروہ ایک خطہ ایک وقت یا ایک نظریہ کا فائدہ نہیں۔ سارے زمانے اور پوری انسانیت کی منفعت پوشیدہ ہے۔

اقبال کے پیغام کا پس منظر یہ ہے کہ بشر ہی خلافت و نیابت الٰہی کی ذمہ داریاں نبھا سکتا ہے۔ وہی دنیا میں خیر کا راج قائم کر سکتا ہے۔ وہی ابلیس کو سرنگوں کر سکتا ہے۔ وہی فلاح انسانی کی شاہراہ پر سنگ منزل نصب کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہی ان امور کا اہل ہے، اور نہیں ہے کوئی۔ اور اس کی نظیر صرف قلب مسلماں میں ہے۔ اور نہیں ہے کہیں۔ عام طور پر اقبال کے پورے اردو و فارسی کلام اور خاص طور پر ابلیس سے متعلق نظموں سے یہی نتیجہ بر آمد ہوتا ہے۔ ابلیس کے تعلق سے لکھی گئی نظمیں یہ ہیں:۔

"جبریل و ابلیس" اور "ابلیس کی عرضداشت" (بال جبریل)

"تقدیر" اور "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" (ضرب کلیم)

"ابلیس کی مجلس شوریٰ" (ارمغان حجاز)

"انکار ابلیس" اور "اغوائے آدم" (پیام مشرق)

"نمودار شدن خواجۂ اہل فراق ابلیس" اور "نالۂ ابلیس" (جاوید نامہ)

یعنی اردو میں پانچ اور فارسی میں چار نظمیں ابلیس کے متعلق ہیں۔

ان نظموں کے تجزیے سے ابلیس، انسان اور بشر کے متعلق اقبال کے کئی بنیادی خیالات روشن ہوتے ہیں:۔

۱۔ ہم نشینیِ ابلیس سے انسان کا مزاج اور طریقۂ فکر اتنا بدل گیا ہے کہ اسے اپنی آزادی بھی آزادی نہیں معلوم ہوتی۔ آزادی سے کام لیتے ہوئے بھی وہ سمجھتا ہے کہ مجبور ہے اور مشیت کو یہی منظور تھا۔ ابلیس خدا سے کہتا ہے۔

اے خدا! کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر   آہ! وہ زندانیِ نزدیک و دور و دیر و زود
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا   ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

خدا پوچھتا ہے:۔

کب کھلا تجھ پہ یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

ابلیس جواب دیتا ہے۔

بعد! اے تیری تجلی سے کمالاتِ وجود

تو خدا فرشتوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے:۔

پستیِ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے   کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام   ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود
(تقدیر۔ ضرب کلیم)

وہ تمام افراد جو ہر امر میں مشیت کو مورد الزام قرار دیتے ہیں۔ ابلیس کے پردے میں اقبال کے ہدف ہیں۔ اقبال انھیں بتاتے ہیں کہ یہ حجت پستی فطرت کی غماز ہے۔

۲۔ چنگیزیوں نے ابلیسی نظام کو سب سے زیادہ تقویت پہنچائی ہے۔ اس کی وجہ سے صرف سیاست میں ہی فتور نہیں آیا۔ معاشرت میں بھی بگاڑ پیدا ہوا۔ مذہب بھی بے اثر ہوتا گیا اور اخلاق بھی انحطاط پذیر ہوا۔ اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ

”ارباب سیاست ساختۂ ابلیس اند“ ؎

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

(ضرب کلیم۔ سیاستِ افرنگ)

اور یہی ابلیسانِ خاکی (سیاست دان) فسادِ عصر حاضر کے ذمہ دار ہیں۔ ابلیس ناری ان سے بہت مطمئن ہے، اس لیے چبا چبا کر باتیں کرتا ہے۔ ؎

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

(بال جبریل۔ ابلیس کی عرضداشت)

مگر یہ اربابِ سیاست ایسے مطیع اور فرمانبردار ہیں کہ مگر ان کے بغیر بھی کوئی کام نہیں کرتے۔ نتیجۃً ابلیس اپنی خدمت سے سبکدوش نہیں ہوتا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے سیاسی فرزندوں کو ہدایتیں جاری کرتا رہتا ہے۔ برہمنوں کو مندروں سے نکال دو، شیخ حرم سے روح محمدؐ چھین لو اور عربوں کو نئے نئے فرنگی تخیلات دے دو تاکہ وہ ہماری دستگیری کے سدا محتاج رہیں۔ اور یہی ہوا۔ جس بندۂ مومن کی پامردی پر خدا کو بھروسا تھا۔ وہ خود مشیت اور مشینوں پر بھروسا کرنے لگا۔ وہ دوسروں کے لیے نمونۂ تقلید کیا بنتا کہ خود ہی مشکوک و متزلزل ہو گیا۔ جب کوتوال خود اپنے محکمے کی افادیت پر شبہ کرنے لگے تو نتیجہ ظاہر ہے۔

اتنا ہی نہیں، انسان ابلیسانِ خاکی کا شکار ہو گیا۔

بشر تا از مقام خود فتاد است — بقدر مجگی او را کشاد است
گنہ ہم می شود بے لذت و سرو — اگر ابلیس تو خاکی نہاد است

(ارمغان حجاز۔ ابلیس خاکی و ابلیس ناری)

یہ تو اور بھی ذلت کی بات ہوئی۔ کیونکہ ابلیس ناری تو یزداں دیدہ و کامل عیار تھا۔ ان ابلیسانِ خاکی کی کیا انفرادیت و تخصیص ہے۔؟ اس لیے۔ ؎

مشو نخچیر ابلیسان این عصر — خساں را غمزۂ شاں سازگار است
اصیلاں را ہمہ ابلیس خوشتر — کہ یزداں دیدہ و کامل عیار است

(ایضاً)

اس بحث سے یہ نتیجہ مستخرج ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک دین سے جدا ہو کر تمام نظام ہائے سیاست ناقص و بے فیض رہ جاتے ہیں۔ ان سے ابلیسیت تو فربہ ہوتی ہے۔ آدمیت نہیں نکھر سکتی۔ ایسے نظام میں رہ کر انسان دوں نظر و کم حوصلہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ ابن آدم پر ابلیس کی گرفت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ کر اغیاری فتوحات سے اس کا جی متلانے لگا ہے۔ ابلیس کے حکم سے کوئی سرتابی نہیں کرتا۔ صیاد سے صید خود کہتا ہے کہ مجھے پکڑ لو۔ یہ فرماں پذیری! الاماں۔!! پھر کیوں نہ ابلیس اترائے۔ اور نشۂ غرور عاجزانہ اور ملتجیانہ روش اختیار کرے۔ جس کی صلب میں طنز شدید کا مادہ بھی موجود ہو۔

اے خداوندِ صواب و ناصواب — من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچ گہہ از حکمِ من سر برنتافت — چشم از خود بست و خود را در نیافت
خاکش از ذوقِ ابا بے گانہ — از شرارِ کبریا بے گانہ
صید خود صیاد را گوید بگیر — الاماں از بندۂ فرماں پذیر

از چنیں صیدے مرا آزاد کن ‏ طاعتِ دیروزۂ من یاد کن
پست از و آں ہمتِ والائے من ‏ وائے من اے وائے من اے وائے من
فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف ‏ تابِ یک ضربم نیارد ایں حریف
بندۂ صاحب نظر باید مرا ‏ یک حریفِ پختہ تر باید مرا
لعبتِ آب و گِل از من باز گیر ‏ می نیاید کودکی از مردِ پیر
ابنِ آدم چیست؟ یک مشتِ خس است ‏ مشتِ خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود ‏ ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود
شیشہ را بگداختن عارے بود ‏ سنگ را بگداختن کارے بود
آنچناں تنگ از فتوحات آمدم ‏ پیشِ تو بہرِ مکافات آمدم
منکرِ خود از تو می خواہم بدہ ‏ سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچد گردنم ‏ لرزہ اندازد نگاہش در تنم
آں کہ گوید از حضورِ من برو ‏ آں کہ پیشِ او نیرزم با دو جو

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست

([illegible])

یہ تو ایک حیلہ شعری ہے کہ ابلیس کو ایسی باتیں کہتے ہوئے دکھایا گیا ہے، مگر اس سے فکر کی تبدیلی ضرور روشن ہوتی ہے۔ یہ احساس ضرور جاگتا ہے کہ ابلیسیت کا جواب کون بنے اور کیسے بنے؟ اس کے جادو سے کون مسحور ہو جاتا ہے۔ اور کون مسحور نہیں ہو سکتا۔ سب لوگ مسحور ہو جا سکتے ہیں، الا عبادك المخلصين ۔

کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ ‏ سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو
(ارمغانِ حجاز۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ)

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے ‏ جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

یعنی امت مسلمہ۔ اور یہ امت جوابِ ابلیس کیسے بنے گی؟ حاملِ قرآن و سنت ہو کر، صرف مسلمان ہونا کافی نہیں۔ حبل المتین کو تھامنا ضروری ہے۔ جو بھی حاملِ قرآن و سنت ہو گیا۔ اس نے شروعِ دینِ محمد یا نظامِ "بشر" کو آشکار کر دیا۔ وہ زندہ مردِ حق پرست ابلیس کا حریفِ پختہ تر ہو گیا۔ ہمہ جہتی انحطاط کا شکار یہ عصرِ حاضر ایسے ہی زندہ مردانِ حق پرست کا منتظر ہے۔

ایسی ہستیوں کو ورغلانے کے لیے ابلیس کے نزدیک کیا چالیں ہو سکتی ہیں انھیں ابلیس کی "مجلس شوریٰ" میں فاش دیکھئے :۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے ‏ یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے۔
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے ‏ تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر ‏ جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے ‏ پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ابنِ آدم کو چاہئے کہ ان چاروں سے ہوشیار رہے۔ ہر زمان اپنے عمل کا حساب کرتا رہے۔ اور حزب اللہ میں شامل ہو کر ابلیسیت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دے۔

۴۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے لکھا ہے۔ کہ اقبال کو ابلیس سے ہمدردی ہے (اقبال ایک مطالعہ۔ ص ۳۹۳ اور ص ۴۱۴) مگر جو تفصیل بیان کی ہے وہ محلِ نظر ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کو ابلیس سے ہمدردی تکبر کی وجہ سے ہوئی اور چونکہ ان کے مزاج میں ابلیسیت کا جز تھا۔ اس لیے نظریۂ خودی پر اس شرح و بسط سے لکھا ہے۔ مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں۔ اقبال کو بلاشبہ ابلیس سے ہمدردی ہے مگر اس کے تکبر کی وجہ سے

نہیں، بلکہ اس منظم فکر، محکم یقین، مسلسل عمل اور بغایت ہوشیاری کی وجہ سے، جس کی مثال آج کی دنیا میں ابلیس کے سوا کوئی دوسرا پیش نہیں کر رہا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے۔ ؎

من بلیٰ در پردۂ لا گفتہ ام   گفتۂ من خوشتر از ناگفتہ ام

(جاوید نامہ نمودار شدن خواجہ اہل فراق ابلیس)

تو اس سے اس کی منظم فکر اور بہایت ہوشیاری کا اندازہ ہوتا ہے، تکبر کا نہیں۔ اس نے لا کے پردے میں دراصل بلیٰ کہا ہے کیونکہ وہ دُردِ آدمؑ رکھتا تھا۔ لا کہہ کر اس نے قہرِ یار کو قبول کر لیا:۔

تا نصیبے از دردِ آدم داشتم   قہرِ یار از بہر او نگذاشتم (ایضاً)

وہ دردِ آدم نہ رکھتا تو اس کے واسطے خود کیوں جنجال میں پھنستا۔ مگر ابنِ آدم کیسے سمجھے کہ ابلیس واقعی دردِ آدم رکھتا ہے؟ وہ اس طرح سمجھے کہ ابلیس ہی کی وجہ سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو ہے۔ اور ؎

شعلہ ہا از کشت زارِ من دمید   او ز مجبوری بہ مختاری رسید
زشتیٔ خود را نمودم آشکار   با تو دادم ذوقِ ترک و اختیار
(ایضاً)

وہ لا نہ کہتا، بلیٰ کہہ دیتا تو یہ صورت کہاں ہوتی۔ قصۂ آدم تو (بے Plot) ہو جاتا۔!!

ابلیس درخود اعتنا حقیقت ہے۔ اقبال نے اس کو صرف راندۂ درگاہ کی حیثیت سے نہیں، رازدانِ خدا کی حیثیت سے بھی سمجھا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے انھوں نے ابلیسیت کو ادائے دلبری کی طرح پرکھا ہے۔ اور کاروبارِ ابلیس پر معروضی اور فلسفیانہ نگاہ بھی تو ڈالی ہے۔ لازماً ان کی شعری حس ایسے نکتے پیدا کر گئی ہے جن میں اجنبیت بھی ہے اور کشش بھی۔

اقبال کے خیال میں ابلیس کی قابلِ رشک صفتیں یہ ہیں:۔

اوّل ۔ انسانوں میں ذاتیں اور فرقہ بندیاں ہیں۔ اور ان کے ہولناک نتائج بھی گردوں نے دیکھے ہیں۔

رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نرشت   کعبہ را کردند آخر خشت خشت
(ایضاً)

لیکن ابلیس کہتا ہے:۔ ؎

کیشِ ما را ایں چنیں تاسیس نیست   فرقہ اندر مذہبِ ابلیس نیست
(ایضاً)

شاید یہ خدا پر بھی طنز ہے۔ جس نے کہا ہے:۔

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ   اور کیا ہے ہم نے تم کو کنبے اور قبیلے
لِتَعَارَفُوْا (الحجرات آیت ۱۳)   تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو۔

طنز سے قطع نظر، کیا یہ سچ نہیں کہ فرقہ اندر مذہبِ ابلیس نیست؟

دوم ۔ اس کے یقینِ محکم کا عجب حال ہے! اس نے آتشِ نمرود کو گلزارِ ابراہیمؑ بنتے دیکھا۔ اسمٰعیلؑ کی فرزندی دیکھی۔ وہ برادرانِ یوسفؑ میں شامل رہا۔ اس نے دربارِ فرعون سے دریائے نیل تک کا تماشا کیا۔ عیسیٰؑ کو صلیب سے پرے دیکھا۔ قریشیوں کی غارِ حرا تک رسائی دیکھی۔ وہ طائف کی گلیوں میں اوباشوں کے ساتھ رہا۔ شہنشاہِ حبشہ کے محل تک پہنچا۔ خانۂ کعبہ کے وسیع صحن میں مسکراتا رہا۔ بدر و حنین میں اس نے ذلتیں اٹھائیں۔ کعبہ سے کربلا تک بشریت کی پامردی اور حق کی سربلندی دیکھی۔ غرض سینکڑوں پیغمبر دیکھے اور بارہا اس کی چالیں ماری گئیں۔ پھر بھی وہ اپنی کافری پر اب تک نازاں ہے۔ ؎

غرق اندر رزمِ خیر و شر ہنوز   صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز

کیا ایسا یقین جو کسی حال میں متزلزل نہ ہو۔ انسانوں کو حاصل ہے؟۔

سوم ۔ تساہل پسندی ابلیس کی خو نہیں۔ وہ ساحل سے نظارہ نہیں کرتا۔ تلاطم ہائے دریا سے کھیلتا ہے۔ موجوں کے تھپیڑے کھانے میں اسے لذت ملتی ہے۔ اور اس کا گرداب عمل مزید پائدار و پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ یعنی جہد مسلسل اس کی زندگی کی روح اور اس کا مدعائے وجود ہے :۔

در عمل چوں زاہدان سخت کوش (ایضاً)

اور وہ بے پناہ قوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کی جنگ اس دمِ آخر تک ہوتی ہے، جب تک حریف شکست کھا کر مطیع نہ بن جائے۔ ؎

خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا   میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

(بال جبریل۔ جبریل و ابلیس)

لیکن ۔

ابن آدم چیست ؟ یک مشتِ خس است   (نالۂ ابلیس)

جس کے لیے ابلیس کا ایک شرارہ کافی ہے۔

مشتِ خس را یک شرار از من بس است

کیا یہ ضروری نہیں کہ ابلیسیت کے خلاف طاقت کا مظاہرہ ابن آدم بھی کرے ؟ اور تساہل پسندی سے ہرگز کام نہ لے۔ ؟

چہارم ۔ ابلیس خود شناس و خودنگر ہے، یہ نہیں کہ آج ہوا۔ وہ انکار سے پہلے بھی تھا۔ ؎

نوری نادان نیم سجدہ بہ آدم برم   او بہ نہاد است خاک من بہ نژاد آذرم

(پیام مشرق۔ انکار ابلیس)

اس فکر کو ابلیس کا تکبر کہا جاتا ہے۔ لیکن اقبال کے رومانی انداز فکر میں یہ تکبر نہیں۔ وہ اسے خود شناسی سمجھتے ہیں جو عیب کی بات نہیں۔

واقعتاً یہ خود شناسی فقط ابن آدم کو زیبا تھی۔ لیکن اس نے کبھی اپنی شناخت کی کوشش نہیں کی۔ اور جب اپنی شناخت ہی نہیں کی گئی تو ذمہ داری کا احساس کیا ہوتا؟ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے کے لیے پہلے اپنے مقام و منصب کو سمجھنا ضروری ہے، اور اپنے مقام کی آگہی اس وقت تک نہیں ہو سکتی۔ جب تک خود تلاشی نہ کی جائے۔ ابلیس نے تکبر نہیں کیا۔ اپنی تلاش کی، اپنے مقام و منصب کو سمجھا۔ اور اپنے فرائض نبھائے۔

می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات   من بہ دو صرصرم من بہ غوِ تندرم
رابطۂ سالمات، ضابطۂ امہات   سوزم و سازم و ہم آتشِ مینا گرم
ساختۂ خویش را در شکنم ریز ریز   تا ز غبارِ کہن پیکرِ نو آورم

اور ان اشعار کو یاد کیجیے جو بال جبریل کی نظم "جبریل و ابلیس" میں ابلیس کی زبانی ادا کیے گئے ہیں۔ بالخصوص یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات   اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لا تقنطوا ؟

(جبریل و ابلیس)

ابلیس چاہے تو وصل نصیب ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ورد لا تقنطوا وظیفۂ ناروا ہو گا۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ اس کی نومیدی (تقنطوا) کے سبب کائنات میں سوز و ساز، درد و داغ اور جستجو و آرزو قائم ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ بے سوز و ساز ہو کر دنیا برباد ہو جائے۔ وہ اگر وصل خواہ ہوا تو اس کا انفرادی وجود کہاں رہے گا اور وہ نہیں رہے گا تو یہ جہانِ رنگ و بو کیونکر برقرار رہ سکے گا ؟ اور دنیا تو دنیا، خود خدا بھی اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ پائے گا۔

بر لبم از وصل می ناید سخن   وصل اگر خواہم نہ او ماند نہ من

(نمودار شدن خواجہ ....)

اس خیال کو اقبال بہت آگے لے گئے ہیں۔ انھوں نے نظریۂ وصل و فراق مرتب کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ ؎

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام

(پیام مشرق۔ اغوائے آدم۔)

غالباً اسی وجہ سے وہ ابلیس کو "خواجہ اہل فراق" سمجھتے ہیں۔ شوق بمیرد ز وصل کو انھوں نے بال جبریل کی نظم "ذوق و شوق" میں بھی پیش کیا ہے۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کر ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذت طلب

"ذوق و شوق" ایک نعتیہ نظم ہے۔ اقبال کی تمنا رہی کہ دربار مدینہ دیکھیں۔ لیکن وہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ ہجران کا مقدر تھا۔ اور لذت طلب کشید کرتے ہوئے وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اس آرزو کو زندگی میں پورا ہوتے ہوئے نہ دیکھ کر انھوں نے وصل فراق کے فلسفے سے نفسیاتی آسودگی حاصل کر لی۔ یہاں اس پہلو پر مزید گفتگو کرنے کی ہمارا اصل موضوع اجازت نہیں دیتا۔

ہماری اصل گفتگو کا سلسلہ یہ چل رہا ہے کہ ابلیس نہایت خود شناس اور منصب فہم ہے۔ اس نے جو ذمہ داریاں اپنے اوپر واجب کر لی ہیں، ان سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا۔ اس کا اپنا مقصد ہمیشہ پیش نظر ہوتا ہے۔ ابن آدم میں گھل مل کر بھی، اخلاق و مروت کے مظاہرے کے باوجود بھی وہ اپنی روش کو نہیں چھوڑتا۔ اور یہ ٹھیک ہی ہے جب وہ سمجھ رہا ہے کہ کائنات اسی کے دم سے روشن و زندہ و فعال ہے تو اسے غفلت ہرگز نہیں برتنی چاہیے۔ اور نہ کسی لالچ (مثلاً خواہش وصل وغیرہ) میں آنا چاہیے۔ اسے ہر حال میں اپنی فطرت پر قائم رہنا چاہیے۔

اس تناظر میں اقبال انسانوں کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ جب ابلیس کے سوچنے کا یہ انداز ہے تو ابن آدم کیوں نہیں سوچتا کہ وہ اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ علی الارض ہے۔؟ اور وہ دین سے بیزار و بے پروا کیوں ہے۔ دین تو اس کی فطری اور لازمی ضرورت اور اس کی شخصیت کی تکمیل کا واحد ذریعہ ہے۔ اور تمام انسانوں کے لیے دین ایک ہی ہے۔ اسی واحد دین فطرت ـ الاسلام ـ پر ہر انسان پیدا کیا گیا ہے۔ تو وہ تفقہ سے کام کیوں نہیں لیتا؟ کیا ابلیس کے کارنامے انسان کی آنکھ کو کھولنے کے لیے کافی نہیں؟ بحکم ابلیس انسان کا کھلا دشمن ہے،

اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝
تحقیق وہ واسطے تمہارے دشمن ہے ظاہر۔

(۲۔البقرہ۔ آیت ۲۰۸)

"عَدُوٌّ مُّبِین" سے ظاہر ہے کہ ابلیس مار آستین نہیں، دشمن نمایاں ہے۔ وہ انسان کو علی الاعلان مبارزت کی دعوت دیتا ہے۔ ؎

کون کر سکتا ہے اس کی آتش سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوز دروں

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

اور

کارگہ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو

(ایضاً)

ملٹن نے اپنے رزمیہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شیطان کو انسان سے تعارض نہ تھا۔ وہ تو دراصل خدا سے اپنی بے حرمتی اور شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن بدلہ لینے کی بہترین تدبیر اس نے یہ سوچی کہ خدا کی کمزور ترین مخلوق "انسان" کو تختۂ مشق بنایا جائے۔ انسان کمزور ترین بھی ہے اور خدا کی نگاہ میں عزیز ترین بھی۔ اس کی پسپائی سے یقیناً خدا کو بیش از بیش دکھ ہوگا۔ لیکن اقبال کی فکر کے مطابق ابلیس نے تمام مخلوقات میں صرف

ابن آدم کو اس لیے چنا کہ یہی جوڑ بن سکتا ہے، انسانوں میں بھی جو خلقاً اور مزاجاً کمزور ہیں، وہ اس کے مرکز نگاہ نہیں۔ وہ کامل عیار ہے تو حریف بھی پختہ تر چاہتا ہے۔ حریف پختہ تر اگر اس کو کہیں مل سکتا ہے۔ تو صرف انسانوں میں۔

انسان و شیطان کے محاربہ کو ملٹن نے بلاشبہ رزمیہ کا روپ دیا ہے۔ اقبال نے رزم نگاری کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن انھوں نے اس معلوم و مشہور واقعے سے جو مضمون آفرینی کی ہے۔ اس کی طرف ملٹن کا ذہن بھی نہیں گیا تھا۔ مثلاً جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ابلیس نے لا کے پردے میں بلی کہا ہے۔ کیونکہ وہ آدم کا درد رکھتا تھا۔ اور اسے مجبوری سے مختاری کی طرف لے جانا چاہتا تھا تو بلاجھجک کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے حدیث ابلیس و آدم میں وہ سخن شعری وضع کیا ہے۔ جس کی مثال ہمیں مغربی ادب میں نہیں ملتی۔ واقعۂ آدم و ابلیس میں اقبال کی فکری مداخلت کی مثالیں اس مقالے میں اور بھی پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض کو انھوں نے قرآن اور بعض کو مشرقی مفکرین مثلاً رومی یا محی الدین ابن عربی کے خیالات سے مرتب کیا ہے۔ اور کئی خیالات ان کے کشیدہ فکر ہیں۔ ان میں کہیں کہیں تطابق مشکل سا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اظہار میں شعری تخیل کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ ان کی کئی نظموں کی شروعات شاعرانہ فضا میں ہوتی ہیں لیکن جلد ہی وہ افکار کی دنیا میں جا پہنچتے ہیں۔ اور وہاں جو قیمتی جواہر ریزے ملے، مختلف قسم کے کیوں نہ ہوں، ان کو اقبال نے طشت شاعری میں سجا دیا ہے۔ اس لیے مختلف نظموں میں مختلف اور کبھی کبھی متضاد قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ ملٹن کے یہاں یہ بات نہیں۔ وہ خروج آدم کے سانحے کو فردوس گم گشتہ (Paradise lost) اور عروج انسانی کی پرشکوہ داستان کو فردوس بازیافتہ (Paradise regaine) میں نہایت منظم، مربوط اور مسلسل طور پر پیش کرتا ہے۔ اور خود بظاہر غیر جانبدار رہ کر خدا کی

شیطان، دونوں فریقوں کی فوجوں کی انتہائی جد و جہد اور کشمکش کو دکھاتا ہے۔ اور رزم نگاری کی تمام ضروری شرطوں کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اس لیے اس کا رزمیہ عظیم شاعری کا نمونہ بن گیا ہے۔ اقبال کا نظام فکر منظم ہوتا۔ اور وہ اسے ایک ہی دو نظموں میں تفصیل و طوالت سے پیش کرتے تو یہ رنگ شاعری کا تاثر زیادہ قائم ہوتا۔ ابھی صورت یہ ہے کہ نو نظموں میں خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں چار فارسی نظمیں ہیں۔ اور فارسی نظموں میں خیالات زیادہ انوکھے قسم کے ظاہر ہوئے ہیں۔ سبھوں کو یکجا کر کے ان میں تنظیم پیدا کرنا آسان کام نہیں۔

یہ طویل اقتباس جملۂ معترضہ کے طور پر ہے۔ آپ اپنے ذہن کو اس اقتباس سے اوپر کے جملوں کی طرف لے جائیے۔ ان کے تسلسل میں یہ کہا جائے گا۔

ابلیس ایک مستقل نار ہے۔ اس کے استقلال کا عجیب عالم ہے!۔

یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ انسان اس کی کمر کو توڑ سکتا ہے۔ وہ اڑا ہوا ہے۔ شاید اس کی نفسیات میں یہ بات ہے کہ اس نے خدا سے باضابطہ معاہدہ کر لیا ہے۔ اور خدا سے کچھ اختیارات حاصل کر لیے ہیں۔ وہ اختیارات انسانوں پر حکمرانی کے لیے کافی ہیں۔ خدا نے بلاشبہ ابلیس کو کچھ اختیارات دے دیئے ہیں لیکن قابل غور نکتہ یہ ہے کہ کیا وہ خدا انسان کو اختیارات عطا کرنے میں بخل کر گیا؟ ہرگز نہیں۔ ہم ہی ناشکرے ہو گئے۔ اپنے مفوضہ اختیارات کی نوعیت و ماہیت کو نہیں سمجھ سکے اور بزدلی کی طرف مائل ہو گئے۔ ورنہ انسان کو تسخیر کے جن وسیع ہمہ گیر اور دائمی امکانات سے آشنا کیا گیا ہے۔ ان کے پیش نظر ابلیس کو خاطر مذکور ہی نہیں۔ ضرورت ہے کہ وہ اپنی اہلیت کو شعوری طور پر محسوس کرے اور شرف انسانی کے حکمت سے کام لے۔ ابلیس انسان کا کھلا دشمن ہے تو لازم ہے کہ انسان بھی ابلیس کا کھلا دشمن بن جائے۔ ابلیس کی دشمنی محتاج رعایت نہیں۔

اقبال کی خواہش ہے کہ انسان ابلیس سے سبق حاصل کرے۔ جیسے مدعی کی چستی سے مدعا علیہ سنبھلتا ہے۔ ابلیس کے عزائم، اس کے طریق کار اور معاشرۂ انسانی میں اس کی مداخلت کے بین و خفیہ اثرات کو اس تفصیل سے اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ انسان وہم و شبہ میں گمراہ نہ رہے۔ اقبال نے تشخیص ابلیسیت کے لیے ہی ابلیس پر اتنی توجہ مرکوز کی۔ ابلیسیت ایک مہلک مرض ہے۔ اس کا علاج وہ سارے لوگ کریں گے۔ جن کے اندر بشر کی صفتیں ہوں گی۔ ان میں ایک اہم ترین اور ناگزیر صفت یہ ہے کہ زمین کے ہنگاموں سے بے تعلق نہیں ہوا جا سکتا۔ صرف زمین کے نیچے اور آسمان کے اوپر یعنی قبر اور جنت و دوزخ کی باتیں بشریت کے منافی ہیں۔ دنیا سے وہ تعلق رکھنا جو اس کا حق ہے۔ بشر کے شایان شان ہے۔ ورنہ ہاتھ میں تسبیح اور دل میں خیال طواف کوئے یار کے ہوتے ہوئے ہمارا معاشرہ پاک و صاف نہیں رہ سکتا۔ ہم کج روی اور غلط کاری دیکھتے رہیں گے۔ اور ہمت نہیں ہوگی کہ ٹوک بھی سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے قوت و کوشش کا مظاہرہ نہایت ضروری ہے۔ ابلیس سے پہلو تہی کر کے ہم ابلیسیت سے بچ نہیں سکتے۔ اس سے نبرد آزما ہونا ہی پڑے گا۔

۵۔ انسان کا منکر ابلیس ہونا مفید ہے۔ نہ ممکن۔ بشریت کی اعلیٰ موثر اور لائق تحسین کارکردگی کے لیے ابلیس کا وجود لازمی ہے۔ ابلیس؛ اقبال کے خیال میں صرف مانع نہیں۔ معاون بھی ہے، وہ نہ ہو تو بشر کی راہ میں رخنے کون ڈالے گا۔ اور رخنہ اندازی نہ ہو تو بشر کی ذہنی صلاحیتیں کیسے آشکار ہوں گی۔ ابلیس رخنے ڈال کر اصل بشر کو آمادۂ بہ اظہار لیاقت کرتا ہے۔ اور اس طرح موخر الذکر کی نہفتہ صلاحیتیں ابھر آتی ہیں غالب نے کہا تھا۔ ؎

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے   رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

یہ معاملہ صرف غالب کے ساتھ مخصوص نہیں۔ عام انسانی فطرت کا یہی خاصہ ہے اور

بے جان چیزیں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اسی خاصہ سے روشنی حاصل کر کے نیوٹن نے عمل اور ردعمل کا عالمگیر قانون وضع کر دیا۔ اور اسی خاصہ کے تحت ابلیس کی مداخلت بشر کے تفاعل کا محرک بن جاتی ہے۔

ع   ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو   (بال جبریل و ابلیس)

ناگزیریت ابلیس کا ایک اور اہم پہلو ہے، غالب ہی نے کہا تھا۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

اقبال نے اس سے اپنے فلسفۂ ابلیس و آدم میں مدد لی۔ ان کے خیال میں آئینہ بشر کی لطافت پوری طرح جلوہ آفرینی کیسے کرے گی؛ لازم ہے کہ اس کی پشت پر کوئی لیپ ہو۔ یہ لیپ ابلیس ہے۔ اقبال نے خودی، عشق، جہد و عمل کے جو نمونے آئینہ رجال میں دیکھے وہ اس وجہ سے پرکشش، عظیم اور لازوال نظر آئے کہ ان کا مقابل ابلیس تھا۔ اور بالآخر وہ آئینہ بشر کا زنگار بن گیا تھا۔ تو ابلیس کو صرف حریف سمجھنا درست نہیں، اسے اپنی شخصیت کا زنگار بنا لینا روا ہوگا۔ اس نکتے میں ایک خاص بات یہ بھی ہے۔ کہ ابلیس کو پس پشت ڈال دینے کی ضرورت ہے، پھر وہ وجہ نزاع خیر و شر نہیں بالآخر خیر ہی کا معاون بن جائے گا۔

اقبال کہتے ہیں کہ دشمن بھی ایک طرح سے حق دوستی ادا کرتا ہے۔ وہ جتنا قوی ہوگا۔ اتنے ہی مقابلے کے امکانات روشن ہوں گے۔ اس لیے اس کے وجود کو خدا کے فضل کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اس فکر کو اقبال نے ان شعروں میں پیش کیا ہے۔

راست می گویم عدو ہم یارِ تست   ہستی او رونقِ بازار تست
ہر کہ دانائے مقامات خودی است   فضل حق داند اگر دشمن قوی است
کشتِ انساں را عدو باشد سحاب   ممکناتش را بر انگیزد ز خواب
(اسرار خودی)

ان اشعار سے اقبال کا نظریہ خیر و شر واضح طور پر مستخرج ہوتا ہے۔ جب ابلیس یار انسان ہو گیا۔ تو پھر شر کا مخرج کہاں رہا؟ خیر سے شر کا مخرج جدا نہیں۔ یہ ایک ہی شاخ کے خار و گل ہیں، اقبال نے اس نکتہ کو نہایت لطیف پیرایہ میں یوں ادا کیا ہے :-

چہ گویم نکتہ ”زشت و نکو“ چیست زباں لرزد کہ معنی پیچ دار است
برون از شاخ بینی خار و گل را درونِ او نہ گل پیدا نہ خار است

(پیام مشرق)

لیکن جب آپ نے برون از شاخ خار و گل کو دیکھا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ سر خار رخسار گل کو چھیڑتا ہے۔ تو آپ نے تنظیم گلستان کی ضرورت سمجھی۔ میرے خیال میں اقبال نے یہاں بشریت کو ”شاخ“ کے استعارہ میں نہایت بلاغت سے پیش کیا ہے۔ بشریت میں خار و گل دونوں کے خواص ہیں۔ ان کا مخرج الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا اور بیگانہ نہیں۔ بشر دونوں کی صفتوں کا حامل ہے۔ پھر بھی تنظیم گلستان کی ذمہ داری اسی کو سونپی گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا شر محض شر نہیں ہوتا۔ وہ خیر کا تابع ہوتا ہے چنگیزیت کے برخلاف اس کی قوت ہابیلیت، ابوذریت، حنین اور کربلا میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ قوت انسانی قبا کو چاک نہیں کرتی، رفو کرتی ہے۔ مگر یہ قوت ہمیشہ ترتیب کی محتاج ہے، اس کی تربیت اب بے پیرو مرشد بغیر ممکن نہیں۔ اور پیروی نصف و ناقص نہیں۔ کامل و واضح ہو تو شری قوت یا ابلیس بھی مومن بشر ہے۔ اس لمحہ درون بشر خیر و شر یکجا و ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اور صرف ایک صفت حاوی و فعال ہوتی ہے۔ خیر کثیر۔ یہی حقیقت بشر ہے۔ اور اسی گوہر تابندہ کی تلاش خدا کو بھی ہے۔

قدم در جستجوئے آدمی زن خدا ہم در تلاش آدمی ہست
(لالۂ طور۔ پیام مشرق)

شاہ ولی اللہ دہلوی کی سوانح حیات
القول الجلی و اسرار الخفی کا نسخہ خدابخش — ایک تعارف

از جناب فضیل احمد قادری خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں شیخ محمد عاشق پھلتی کی نوشتہ حیات شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳ - ۶۲) کا ایک قدیم مگر ناقص مخطوطہ موجود ہے۔[1] مگر مخطوطے پر اس کتاب کا نام افادات شاہ ولی اللہ تحریر ہے۔ راقم الحروف جب خدابخش لائبریری آیا تو اس کے ذمہ تصوف اور صوفیہ کے تذکروں کی کیٹلاگ سازی کا کام تفویض ہوا۔ دوران مطالعہ اس کتاب کے اندرونی صفحات پر دو جگہ القول الجلی لکھا ہوا ملا۔ میں نے اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور استاذ محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کی کتاب شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات[2] کے ضمیمے سے استاذ محترم کے مضمون مولانا محمد عاشق پھلتی کی نوشتہ حیات شاہ ولی اللہ المعروف بالقول الجلی و اسرار الخفی کا تعارف سے اس کا مقابلہ کیا۔ نسخہ ہذا کے مندرجات مل گئے۔ اور راقم الحروف کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔[3] پھر جب ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو استاذ محترم پٹنہ تشریف لائے تو

---

[1] فارسی مخطوطات، ج ۴ ہینڈ لسٹ نمبر ۱۴۰۹۔ یہ نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، دہلی سے ۲۱ مارچ ۱۹۶۷ء کو خریدا گیا۔

[2] مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۹ء شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتوبات بھی شیخ محمد عاشق پھلتی نے جمع کیے تھے اگرچہ اس کی ابتدا انکے صاحبزادے شیخ عبدالرحمٰن نے کی تھی۔ مگر ان کی بے وقت موت کے بعد اس کی تکمیل شیخ محمد عاشق نے کی۔ سیاسی مکتوبات، ص ۵۰۔

[3] القول الجلی و اسرار الخفی کا تعارف سب سے پہلے استاذ محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے نسخہ کاکوری جو واحد مکمل نسخہ ہے کی بنیاد پر شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات کے ضمیمے میں پیش کیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ دوسرا نامکمل نسخہ متعارف کرانے کی سعادت استاذ محترم کے ایک ادنیٰ شاگرد کے حصے میں آئی۔

انھیں یہ نسخہ دکھایا گیا۔ انھوں نے اپنی تشفی کا اظہار کرتے فرمایا کہ غنیمت ہے۔ محب مکرم جناب مسعود انور علوی لکچرر شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جن کا تعلق خانوادۂ کاکوری سے ہے اور جن کے ہاں القول الجلی کا مکمل نسخہ موجود ہے۔ انھیں بھی میں نے یہ نسخہ دکھایا۔ ان کی رائے ہے کہ اگرچہ نسخہ خدا بخش ناقص الاول ہے۔ مگر بقیہ حصص پورے ہیں۔ اور نسخہ کاکوری سے پوری مطابقت ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات میں۔ استاذ محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب القول الجلی و اسرار الخفی کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"مولانا محمد عاشق پھلتیؒ نے شاہ صاحبؒ کے حالات، سوانح اور ملفوظات کو ایک کتاب القول الجلی و اسرار الخفی میں قلمبند کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اس کتاب کو خود ملاحظہ فرمایا تھا۔ لیکن اس کتاب میں اضافہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اور مصنف نے شاہ صاحبؒ کی وفات پر اس میں مزید ایک باب کا اضافہ کیا۔"[1]

القول الجلی کا نسخہ خدا بخش نہایت خوش خط ہے۔ اور خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ اس کا سائز ۷ انچ × ۵ انچ ہے۔ تعداد اوراق ۶۵ ہیں۔ اور اگر اوراق کو صفحات میں تبدیل کیا جائے تو کل ۱۳۰ صفحات ہوتے ہیں۔ ہر ورق پر ۲۹ سطریں ہیں اور ہر سطر میں ۳۰ سے ۳۵ تک الفاظ ہیں۔ موجودہ نسخے میں صرف قسم ثانی اور قسم ثالث موجود ہے۔ قسم ثانی میں شاہ صاحبؒ کے ملفوظات ہیں۔ اور ہر ملفوظ "افادہ" کے عنوان سے تحریر ہے۔ لفظ افادہ ہر جگہ سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ قسم ثالث میں شاہ صاحبؒ کے بزرگوں، اعزہ، خلفاء اور احباب کا ذکر ہے۔ اور اس کے عنوانات بھی سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ کتاب میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ اختتام پر ختم شد

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، ضمیمہ ۳، ص ۲۱۰، شیخ محمد عاشق نے القول الجلی کے علاوہ دو تصانیف سبیل الرشاد اور شرح دعاء الاعتصام یادگار چھوڑی ہیں۔ ص ۲۰۔

والحمد للہ تعالی اولاً و آخراً و ظاہراً و باطناً

تحریر ہے اور اس کے دائیں اور بائیں طرف کسی نے بعد میں:

اللھم ارحم علی محمد عمد ماید حبیک صلعم کا اضافہ کر دیا ہے۔

طرز تحریر، کاغذ اور روشنائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اٹھارہویں صدی کا نسخہ ہے۔ کتاب کے شروع میں کوئی نام تحریر نہیں ہے۔ ورق ۲۵ الف پر القول الجلی سرخ روشنائی سے حاشیہ پر تحریر ہے۔ اور قسم ثالث کے شروع میں حاشیہ پر "قسم ثالث القول الجلی" تحریر ہے۔ پورے نسخے میں پانچ جگہ مہر ثبت ہے۔ مگر چار جگہ اس قدر مدھم ہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔ ورق ۱۴ ب پر قدرے صاف اور غور سے پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے۔ مہر اس طرح ہے

العبد المذنب ولایت علی

سنہ ۱۲۶۹ ہجری

یہ پہلے عرض کیا جا چکا کہ نسخہ خدا بخش ناقص الاول ہے اور موجودہ نسخے میں صرف قسم ثانی اور قسم ثالث ہے۔ قسم ثانی کی شروعات اس طرح ہے:

"قسم ثانی در بیان نکات ارشاد سمات۔ باید دانست کہ کلمات قدسیہ حضرت ایشاں کہ در بیان غوامض، اسرار از حقائق لاھوتیہ و جبروتیہ و معارف لدنیہ کہ از دست فہم و ادراک ہر اہل ذوق و وجدان بدامن آں نرسد۔ پس ایراد آنہا دریں رسالہ کہ بنا بر آں بر تعمیم افادہ کافہ خصوص و عموم است سودی ندارد و اگر صاحب استعدادی بر شوق اطلاع آں دقائق دارد باید کہ از کتاب تفہیمات الٰہیہ و حجۃ بالغہ و خیر کثیر و لمعات و ہمعات و الطاف القدس و فیوض الحرمین وغیرہ از مصنفات کرامت آیات طلب نماید، اما بعض انفاس نفیسہ متضمن دقائق و آداب مبدا سلوک و معاد

انتہاء آں کہ در ارشاد مستفیضان جناب ولایت تحریراً یا تقریراً صدور یافتہ بود
بتحریر آں اظہار روایۃً بالفظاً و نقلاً بالمعنی ایں رسالہ را متحلی و مزین می سازد۔ اللہ تعالےٰ
ہو الولی والموفق۔"[1]

اس کے بعد شاہ صاحبؒ کی ہر تقریر یا ملفوظ افادہ کے عنوان سے تحریر ہے۔ اور افادات
کی مجموعی تعداد ۱۰۰ ہے:

۱۔ افادہ بعد حضوری در میان مرشد و مسترشد۔
۲۔ افادہ باید دانست کہ مردم در جبلت یکساں نیستند.....
۳۔ افادہ اکثر اشخاص کہ رغبت راہ خدا دارند .....
۴۔ افادہ جہد تمام از سینہ می باید برآورد .....
۵۔ افادہ بسوی امر منزہ متوجہ می باید شد ..... (۶) افادہ بسا می بود کہ
حضور مجرد حاصل می شود ..... (۷) افادہ یقین باید کرد کہ آدمی فی الحقیقت عبارت
از صورت شخصیۂ او ست ..... (۸) افادہ غوث الاعظم الشیخ عبد القادر رضی اللہ عنہ ازیں
حالت بفنا ارادہ تعبیری فرمایند ..... (۹) افادہ قلت طعام و دوام صیام ....
(۱۰) افادہ سالک چوں عزلت اختیار کند ..... (۱۱) افادہ کسی را کہ توحید منکشف شد۔
(۱۲) افادہ بسا اتفاق می افتد کہ سالک ..... (۱۳) افادہ فنا نفس و صفا نفس .....
(۱۴) افادہ ما نیک تامل کردیم..... (۱۵) افادہ باید دانست کسے کہ مالوف با حواس
است ..... (۱۶) افادہ سالک را گاہے تشویش روی دہد..... (۱۷) افادہ حضرت
سید امیر کلال قدس سرہ ..... (۱۸) افادہ مدرک حق سبحانہٗ باد را کہ .....

---

[1] القول الجلی ورق۔ الف

(۱۹) افادہ باید دانست کہ احوال نبی آدم ..... (۲۰) افادہ چوں بدانستی کہ ظل
گیتی ..... (۲۱) افادہ قیام لیل و سبق باطن ..... (۲۲) افادہ شجاع
را در حرب تواں دانست ..... (۲۳) افادہ کشف و کرامات علوم .....
(۲۴) افادہ اعلم الاصل السعادت ..... (۲۵) افادہ حضرت ایشاں فرمودند
کہ سالک سبیل حقیقت ..... (۲۶) افادہ بعد وصول بذات ..... (۲۷)
افادہ سالک را از وظائف ظاہرہ ..... (۲۸) افادہ در ہمہ حال در توجہ حضرت
..... (۲۹) افادہ رباعی ..... (۳۰) افادہ کیفیتی کہ حاصل می شود .....
(۳۱) افادہ حضرت ایشاں رباعی چند در بیان بعض قواعد سلوک نظم فرمودند ..... (۳۲)
افادہ اگر خواہم کہ لطیفۂ قلب کسی را ..... (۳۳) افادہ حضرت ایشاں ارشاد فرمودند
کہ تکمیل بجز بہت ..... (۳۴) افادہ حضرت ایشاں فرمودند کہ نقطۂ لاہوت .....
(۳۵) افادہ حضرت ایشاں ارشاد فرمودند کہ اگر وجود کل ..... (۳۶) افادہ
حضرت ایشاں فرمودند کہ ارواح مردمان ..... (۳۷) افادہ خواجہ محمد امین بفقیر
راقم ارقام نمودند ..... (۳۸) افادہ نیز خواجہ موصوف نگارش نمودند .....
(۳۹) افادہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ..... (۴۰) افادہ بجناب ایشاں سانحہ
(۴۱) افادہ ارشاد فرمودند کہ چوں تجلی اعظم ..... (۴۲) افادہ ارشاد فرمودند کہ
تحقق عصمت انبیاء ..... (۴۳) افادہ ارشاد فرمودند کہ توجہ ملائکہ ..... (۴۴)
افادہ روزی سخن در غیرت ارواح ..... (۴۵) افادہ نفس ناطقہ کہ با روح .....
(۴۶) افادہ فرمودند کہ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر ..... (۴۷) افادہ فرمودند کہ
علم بر دو نوع است ..... (۴۸) افادہ معروض داشتم کہ مبتدیان ..... (۴۹) افادہ

صوفی بیگ خان مروی ...... (۵۰) افادہ معروض داشتم کہ در حدیث ......
(۵۱) افادہ بتقریب تعزیہ معنی حدیث ...... (۵۲) افادہ ارشاد فرمودند کہ نسبت ۔
(۵۳) افادہ فرمودند سعادت دنیوی منقسم ...... (۵۴) افادہ انبعاث میل بسوی
حقیقۃ الحقایق ...... (۵۵) افادہ ارشاد فرمودند کہ طبقات پاس ...... (۵۶) افادہ
فرمودند حق سبحانہ وتعالےٰ اعطی از علوم ...... (۵۷) افادہ ارشاد فرمودند کہ حکمت در شفاعت
انبیاء ...... (۵۸) افادہ ارشاد فرمودند کہ کمل اولیاء را ہم حیرت می باشد ......
(۵۹) افادہ ارشاد فرمودند کہ حضرت والد بزرگوار وعم گرامی قدر ...... (۶۰) افادہ
روزی یکے از حاضران این بیت ہندی کہ منسوب است بجناب حضرت محبوب صمدیت
سیدنا شیخ ابو الرضا قدس سرہ[1] ...... (۶۱) افادہ فرمودند کہ حصول نسبت ......
(۶۲) افادہ ارشاد فرمودند کہ رسالہ حضرت شیخ تاج الدین سنبھلی ...... (۶۳) افادہ
ارشاد فرمودند کہ نسبت اویسیہ ...... (۶۴) افادہ بتقریب تمثیل تاثیر صحبت فرمودند ...
(۶۵) افادہ ارشاد فرمودند کہ ہنگام زیارت کعبہ ...... (۶۶) افادہ سخن در ذکر

---

[1] شیخ ابو الرضا کا ہندی بیت یہ ہے ؎

دنا اندھیری چاندنی راتا   نکلی پو جیھو پیتم ماتا

شیخ ابو الرضا الہندی (م ۱۱۰۱ھ) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے بڑے چچا تھے، علوم ظاہری کی تکمیل حافظ بصیر سے کی اور خواجہ خورد خلف الصدق خواجہ باقی باللہ سے تصوف کی تعلیمات حاصل کیں، شروع میں دربار شاہی سے وابستہ رہے، مگر جلد ہی اس سے کنارہ کش ہو کر مسجد فیروزہ آباد کے قریب ایک حجرے میں رہنے لگے، شیخ ابو الرضا اپنے عہد کے جید عالم تھے، درس تدریس کا بھی شوق تھا۔ آخری زمانے میں صرف مشکوٰۃ اور تفسیر بیضاوی کا درس دینا پسند کرتے تھے، وعظ میں بڑی تاثیر تھی، نماز جمعہ کے بعد ہمیشہ وعظ کہتے تھے احادیث کا

بعض رجال معتبرین ...... (۶۷) افادہ ارشاد فرمودند کہ شیخ عبد الرحمن نیمی ...... (۶۸)
افادہ ارشاد فرمودند کہ طائفہ از مجذوبین ...... (۶۹) افادہ در ضمن تقریر استعدادات نفوس
(۷۰) افادہ ارشاد فرمودند کہ حکمت در سکوت ...... (۷۱) افادہ در اثنای تقریر بر معنی این
حدیث ...... (۷۲) افادہ فرمودند سعادت ہر ذکی وغبی در این راہ ...... (۷۳) افادہ
فرمودند میراث انبیاء علیہم السلام ...... (۷۴) افادہ ارشاد فرمودند کہ طائفہ از مقربین
...... (۷۵) افادہ ارشاد فرمودند کہ خرابی آدمی از خطرات نفس اوست ...... (۷۶)
افادہ خوف حیفی است از معرفت الہی ...... (۷۷) افادہ در معنی حدیث الدنیا
سجن المؤمنین ...... (۷۸) افادہ ارشاد فرمودند کہ بعض بندگان الہی ......
(۷۹) افادہ ارشاد فرمودند کہ توجہ الی اللہ ...... (۸۰) افادہ در علاج ازالہ رذایل باطن
...... (۸۱) افادہ فرمودند عقلاء زبان مقرر داشتہ ...... (۸۲) افادہ فرمودند غیر تہا
مشایخ روزگار ...... (۸۳) افادہ فرمودند از دو شیئی اکبر میل سلطنت ...... (۸۴)
افادہ فرمودند تفضیل عالم بر عابد ...... (۸۵) افادہ عزیزے بخدمت ایشان ذکر کرد کہ
...... (۸۶) افادہ در شرم حکمت مشروعیہ ...... (۸۷) افادہ ارشاد فرمودند لذی
تحمل الکشاف ...... (۸۸) افادہ ارشاد فرمودند کہ کشف بعض معارف ...... (۸۹)
افادہ ارشاد فرمودند کہ حق تعالی با ما معیت ...... (۹۰) افادہ در تفسیر آیۃ کریمہ یدبر
الامر من السماء ...... (۹۱) افادہ التماس نمودم از معنی این قول ...... (۹۲) افادہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۸) فارسی اور ہندی میں ترجمہ بیان کرتے تھے۔ ملاحظہ انفاس العارفین، ص ۱۰۹، استاذ محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کا خیال ہے کہ مذہبی کتب کو عوامی زبان میں منتقل کرنے کی اہمیت کو سب سے پہلے انھوں نے ہی محسوس کیا تھا۔ تاریخ مشائخ چشت، جلد ۵، ص ۹۰۔

رضای عرض کردہ بودم کہ مشاہدۂ صورت ...... (۹۳) افادہ معنی حدیث شریف کہ نسائی روایت کردہ ...... (۹۴) افادہ در تخصیص عشرہ مبشرہ ...... (۹۵) افادہ وصیت این فقیر ...... (۹۶) افادہ فی تمیز الملتبسین ...... (۹۷) افادہ در حدیث متواتر آمدہ است ...... (۹۸) افادہ خود جوامع العلم عنی ...... (۹۹) افادہ اولیہ ارواح کمل ...... (۱۰۰) افادہ تورع واتقا شبہات اصلی است ...... (۱۰۱) افادہ چون علمی از مبدأ فیاض ...... (۱۰۲) افادہ در قواعد طب ثابت شدہ ...... (۱۰۳) افادہ دگاہی طبیعت کلیہ کہ بمنزلہ فرس قطوف ...... (۱۰۴) افادہ احوال نفسانیہ مثل دبیر وزبر ...... (۱۰۵) افادہ دعاہای بنی آدم بحظیرۃ القدس ...... (۱۰۶) افادہ ہر خرق عادتی در ہر واقعہ عجیبہ ...... (۱۰۷) افادہ شخصی از مستحلان مزامیر گفت ...... (۱۰۸) افادہ بعض صفات محمودہ با صفات غیر محمودہ ......

قسم ثالث دس بزرگوں کے احوال پر مشتمل ہے۔ جن میں شاہ صاحبؒ کے قرابت مندگگ، برادران گرامی، احباب اور اجلہ خلفاء شامل ہیں، اخیر میں مولف نے بطور ضمیمہ اپنے حالات قلمبند کئے ہیں[1]۔ قسم ثالث کے شروع کی عبارت درج ذیل ہے۔

> "قسم ثالث در ذکر احوال واقوال بزرگانی کہ بحضرت ایشان نسبتی وقرابتی دارند۔ دریں قسم اول بذکر شیخین جلیلین کہ خال کبیر وخال صغیر حضرت ایشانند شروع رفتہ۔ اگرچہ قصہ بندۂ کاتب الحروف آنست کہ بتوفیق الٰہی رفیق شود در ذکر ماقدم

---

[1] مولف تحریر فرماتے ہیں۔ کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے باصرار تمام فرمایا کہ تم اپنے حالات بھی قلمبند کرو، میرے تامل کرنے پر انھوں نے خود مختصراً میرے حالات لکھے۔ مولف نے شاہ صاحب کے تحریر کردہ حالات کو تبرکاً ورق ۵۵ ب سے ۶۰ ب تک نقل فرمایا ہے پھر تفصیل بیان کی ہے۔

> جناب مع ذکر بعض اصحاب رسالہ مستقلہ ترتیب دہد۔ اما دریں رسالہ ہم کہ مبنی است بر ذکر بزرگان این خاندان عالیشان کہ این بندہ بشرف ادراک سعادت خدمت شان مشرف گشت بذکر پارہ از حالات کرامت آیات وکلمات معرفت سمات ذخیرہ اندوز سعادت دو جہانی گشت تا اگر ثانیاً حال بتائید الٰہی بامضاء آن عزیمت موفق گردد بمصداق ہو المسک ماکررتہ یتضوع خواہد بود والا نہ بحکم مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ بالکلیۃ ازان دولت محروم نماند و چون این قسم موضوع برای ذکر بزرگانی است کہ بحضرت ایشان نسبتی وقرابتی دارند قاعدہ الاقرب فالاقرب میخواست کہ ذکر احوال کرامت اشتمال ہر دو برادر آنجناب تقدیم یابد لیکن امتثالا لامر ولی الامر کہ خالی از حکمت دیگری نیست ذکر شیخین مقدم کردہ شد۔"

مولف نے ان بزرگوں نے ملفوظات کا انتخاب بھی 'افادہ' کے ذیلی عنوان سے ہر ایک کے ذکر کے ساتھ دیا ہے۔

۱۔ شیخ عبید اللہ خاں کبیر حضرت ایشان[1] (۲) شیخ حبیب اللہ خاں صغیر حضرت ایشان[2] (۳) شیخ صلاح الدین برادر خورد۔[3] (۴) شیخ اہل اللہ برادر خورد[4] (۵) شاہ نور اللہ خلیفہ واز قدماء اصحاب وکملاء احباب (۶) حافظ عبد الغنی المخاطب بہ عبد الرحمن از خلفاء معتبر۔ (۷) خواجہ محمد امین ولی اللّٰہی اجلۂ احباب (۸) میاں محمد شریف خلیفہ حضرت ایشان (۹) مولوی شرف الدین محمد از خواص تلامذہ۔ (۱۰) تذییل در حکایت حال عبد ذلیل بندہ مولف این رسالہ۔

---

[1] مولف کے والد بزرگوار [2] مولف کے عم محترم [3] شیخ صلاح الدین شاہ عبد الرحیم کی محل اولی سے تھے۔ جو خواجہ یوسف قتال کی اولاد میں سے تھیں۔ شیخ صلاح الدین طبیب حاذق تھے، اور فن سپہگری کے ماہر

[4] وفات ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء۔

حالات مولف

شیخ محمد عاشق، شیخ عبداللہ کے صاحبزادے، اور شیخ محمد کے پوتے تھے، یعنی وہ شاہ ولی اللہؒ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ شیخ محمد عاشق کی ولادت بمقام پھلت ضلع مظفرنگر ۱۰ رمضان ۱۱۱۰ھ مطابق ۲ مارچ ۱۶۹۹ء کو ہوئی۔ محمد غازی سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔[1]

جب قرآن کے چند سپارے، تمام کر چکے تو ان کے نانا شیخ عبدالوہاب[2] نے قرآن مکمل کرایا۔ اور خط نسخ اور نصاب صبیان کی تعلیم دی۔ بعد ازاں میزان صرف اور بوستان سعدی اپنے دادا شیخ محمد سے تمام کی اور کتب تحصیلہ اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں۔ کافیہ قدوری اور شرح ملا اپنے چچا شیخ حبیب اللہ سے مکمل کرنے کے بعد اپنے والد بزرگوار سے باطنی تعلیم حاصل کی۔[3]

شیخ محمد عاشق اوائل عمری سے شاہ عبدالرحیمؒ کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے، لڑکپن سے شاہ ولی اللہؒ سے ایک خاص انسیت تھی۔ ان کی محبت اور رفاقت سے شاہ عبدالرحیمؒ بہت متاثر تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:۔

فیما بین این ہر دو اخلاص بسیار است و ما بسیار خوش و راضی ہستیم۔[4]

شیخ محمد عاشق اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

”ایک شب جب شاہ عبدالرحیمؒ وضو کے لیے بیٹھے تو میں ان کے سامنے سے گزرا، انھوں نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ تم ان کے (شاہ ولی اللہؒ) کے شرح ہدایہ حکمت کے درس میں شریک نہیں ہوتے تو میں نے لڑکپن کی شرارت میں عرض کر دیا کہ وہ مجھ پر توجہ ہی نہیں فرماتے۔ اتنے میں وہ (شاہ ولی اللہؒ) ادھر سے گزرے تو شاہ عبدالرحیمؒ نے ان کا دامن پکڑ کر مجھ سے فرمایا اسے تھام لو۔[5]“

---

[1] القول الجلی، ورق ۲۰ ب۔ شیخ محمد عاشق عمر میں شاہ ولی اللہ سے تقریباً ۵ سال بڑے تھے۔ [2] ایضاً۔ شیخ عبدالوہاب، شاہ عبدالرحیمؒ کے ہم عصر بزرگ تھے۔ اور سلوک و احسان میں ممتاز تھے۔ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً، ورق ۱۰۱ الف۔

پھر تو یہ دامن ایسا ہاتھ میں آیا کہ تادم واپسیں نہ چھوٹا۔ شیخ محمد عاشق خلوت و جلوت، سفر و حضر اور تصنیف و تالیف سب میں شاہ ولی اللہؒ کے رفیق رہے، شاہ صاحبؒ سے انھوں نے شرح تجرید مع حاشیہ قدیم، شمس بازغہ، محکم الاصول، افق المبین اور صحیح مسلم پڑھی۔[1]

۱۱۴۳ھ میں شاہ صاحبؒ سفر حجاز پر روانہ ہوئے تو شیخ محمد عاشق ان کے رفیق سفر تھے دوران قیام حجاز انھوں نے شاہ صاحبؒ سے تفسیر بیضاوی سے سورہ فاتحہ کی تفسیر پڑھی اور شیخ ابوطاہر کردی مدنی سے صحیح بخاری اور دارمی کے سبق میں شاہ صاحب کے ہم سبق رہے، اور بقول خود شاہ صاحبؒ کے طفیل میں اس کی اجازت بھی حاصل ہوئی۔[2]

دوران قیام حجاز شیخ محمد عاشق برابر شغل طریقت میں منہمک رہے۔ اور ہر قدم پر انھیں شاہ صاحب کی رہنمائی حاصل رہی۔ معارف حرمین کی سعادت خطاب سب سے پہلے انھیں حاصل ہوئی۔ وہ خود لکھتے ہیں:۔

”در ہمہ معارف حرمین مستعد بسعادت خطاب بلکہ رسالہ فیوض الحرمین بالتماس ایں عبد ضعیف مولف گردید و بسعادت تبییض ایں خاکسار مستعد گشت۔[3]

شاہ صاحبؒ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ان کے نام معنون کی۔

”کتاب حجۃ اللہ البالغہ کہ از عمدہ تصانیف آنجناب در علم خاص اسرار شریعت

---

[1] ایضاً۔ القول الجلی ورق ۱۶۱ الف . . . .

[2] ایضاً۔ ورق ۱۶۲ الف [3] ایضاً ورق ۱۶۱ ب شیخ محمد عاشق حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک عربی شعر لکھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ حضرت بار بار مجھے یہ مجھے یہ لکھا کرتے تھے۔ ؎

وَاِنِّی وَاِنْ خَاطَبْتُ اَلْفَ مُخَاطَبٍ   فَاَنْتَ الَّذِیْ اَعْنِیْ وَاَنْتَ الْمُخَاطَبُ

(میں ہزار لوگوں سے مخاطب ہوا، لیکن میرا مدعا تو ہے۔ اور تو ہی میرا مخاطب ہے۔)

است معنون بنام کمترین فدویان است۔[1]

شاہ صاحبؒ نے اپنی تصنیف الخیر الکثیر انھیں سبقاً سبقاً پڑھائی اور اس کے دقائق حل فرمائے۔[2] قیام حجاز کے زمانہ میں جب شاہ صاحبؒ کو رسول اکرمؐ کی زیارت نصیب ہوئی تو سب سے پہلے شیخ محمد عاشق ہی ان سے مستفید ہوئے۔ فرماتے ہیں :۔

"وبعد سلوک جدید حضرت ایشاں بطریق اویسی از روح کریمہ حضرت خاتم الرسل صلوات اللہ وسلامہ علیہ اول کسے کہ بشرف بیعت آنجناب مشرف شد ایں بندہ است و بیعۃ ثانیہ[3] و ایں بیعت در شب قدر فی ثلث الاخیر در حجر کعبہ تحت میزاب الرحمۃ بود فالحمد للہ علی ذٰلک"[4]

ایک دوسرے موقع پر کچھ اسی قسم کی نعمت سے شاہ صاحبؒ نے آپ کو دوبارہ سرفراز فرمایا۔

"وچوں بعد مراجعت ازاں سفر کرامت اثر حضرت ایشاں در واقعہ بجناب حضرت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم بیعت نمودند و از آنجناب بافاضۂ رحمت خاص ختمیہ ممتاز شدند، اول شخصی کہ بعد ایں واقعہ مبارکہ بخدمت کرامت منقبت حضرت ایشاں باں حیثیت شرف بیعت حاصل نمود ایں عبودیت نماد بود؛ تلک بیعۃ ثالثۃ۔ وایں عبد ضعیف آنچہ ذخیرہ شرف وسعادت ہر دو جہاں میدارد ہمیں بیعتہا ست کہ گذاشتہ است و بس الحمد علی ذٰلک حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ"[5]

شیخ محمد عاشق، شاہ صاحبؒ کے مونس وغمخوار شاگرد، مرید اور عزیز تھے۔ شاہ صاحبؒ کو ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ ان کا انتقال پھلت ضلع مظفر نگر ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں ہوا۔

---

[1] ایضاً [2] ایضاً [3] ایضاً۔ یہ امر تعجب ہے کہ شیخ محمد عاشق نے اپنے بیعت اول کا حال کہیں بیان نہیں کیا ہے۔ [4] ایضاً ورق ۶۱ ب [5] ایضاً ورق ۶۳ الف۔

مطبوعات جدیدہ

الجامع لشعب الایمان الجزء الاول والجزء الثانی تالیف امام حافظ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی تحقیق وتحشیہ ڈاکٹر عبد العلی عبد الحمید حامد، تقطیع کلاں، کاغذ وطباعت بہت عمدہ، صفحات اوّل ۵۶۰ وثانی ۸۰۰، مجلد قیمت تحریر نہیں، پتہ الدار السلفیہ ۶/۸ اے حضرت ٹیرس شیخ حفیظ الدین روڈ، بائیکلہ برج، بمبئی ۴۰۰۰۰۸۔

امام بیہقی پانچویں صدی کے نامور محدث تھے۔ حدیث وفقہ دونوں میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اور ان میں ان سے متعدد و بلند پایہ تصنیفات یادگار ہیں۔ حال میں مصر اور عرب ملکوں میں ان پر قابل ذکر کام ہوا ہے، مولانا تقی الدین ندوی مظاہری شیخ الحدیث عین یونیورسٹی نے امام صاحب کی مشہور تصنیف الزہد الکبیر کو ایڈٹ کرکے کویت سے شائع کیا ہے۔ اور ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی استاذ جامعہ مدینہ منورہ نے المدخل الی السنن کو حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، اب الدار السلفیہ بمبئی نے ان کی اہم بالشان کتاب الجامع لشعب الایمان کو پہلی مرتبہ ایڈٹ کرکے شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، گذشتہ برس اس کی یہ دونوں جلدیں وہیں سے شائع ہوئی ہیں۔ مصنف علام نے اس کتاب میں مشہور حدیث الایمان بضع وسبعون شعبۃ کے مطابق ایمان کے ستر شعبوں کا ذکر کرکے انکی تشریح و وضاحت کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں دوسری روایات و احادیث کے علاوہ قرآنی آیات اور محدثین کے اقوال سے بھی مدد لی ہے۔ پہلی جلد میں شعب الایمان سے متعلق حدیث کے بعض طرق نقل کرکے ایمان کی حقیقت و ماہیت وغیرہ پر گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد ایمان کے پہلے شعبہ ایمان باللہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں اللہ کی اور اس کی صفات و اسماء کی معرفت اور اسکے ذاتی و صفاتی ناموں وغیرہ کی وضاحت مختلف آیتوں اور حدیثوں سے کی ہے۔ اسکے بعد ایمان

دوسرے شعبوں رسولوں، ملائکہ، کتابوں اور تقدیر پر ایمان کا ذکر ہے۔ دوسری جلد میں ایمان کے مندرجہ ذیل شعبوں کا تذکرہ ہے۔ آخرت پر ایمان بعث و نشور بعد الموت، حشر، جنت، دوزخ اور محبت الٰہی، یہ دونوں جلدیں الدار السلفیہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبد العلی نے بڑی محنت سے ایڈٹ کی ہیں۔ حواشی میں نسخوں کے فرق و اختلاف کی صراحت، آیات و احادیث کی تخریج اور راویوں کے متعلق مستند معلومات اکٹھا کیے ہیں، اور مقدمہ کے پہلے حصہ میں امام بیہقی کے حالات اور علمی کمالات تفصیل سے قلمبند کیے ہیں اور دوسرے حصہ میں انکی اس تصنیف کی اہمیت و نوعیت، سبب تالیف، نہج تصنیف، مختلف کتبخانوں میں اسکے موجود نسخوں اور کتاب کے راویوں کے ناموں اور حالات وغیرہ کے بارہ میں ضروری باتیں تحریر کی ہیں، ابتدا میں بعض نسخوں کے اول و آخر صفحوں کے عکس بھی دیے ہیں، طباعت کے حسن و دلکشی کیلئے الدار السلفیہ کا نام ہی پوری ضمانت ہے، جس نے جدید آلات طباعت مہیا کر کے قدیم نادر و نایاب امہات کتب کو اہتمام سے شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔

اسلام کا نظام طلاق: ۔ مرتبہ مولانا شکر اللہ صاحب نعمانی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۲، قیمت ۵ روپے پتے (۱) مدرسہ انوار العلوم مبارکپور، اعظم گڈھ (۲) نعیم بکسیلر، صدر بازار مئو اعظم گڈھ (۳) مکتبہ سلفیہ و مرکزی دار العلوم، ریوڑی تالاب، وارانسی۔

اس کتاب میں طلاق پر جو بحث کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں طلاق گو بہت معیوب و مبغوض ہے تاہم بعض مخصوص حالتوں میں یہ جائز ہے لیکن اس معاملہ میں طلاق دینے والا آزاد اور مطلق العنان نہیں ہے بلکہ اسے شریعت محمدی کے اصول و ضابطے کے مطابق طلاق دینی چاہیئے، اس سلسلہ میں مصنف نے طلاق کی صحیح اور مسنون صورتیں بھی بیان کی ہیں، اور بدعی و ناجائز صورتیں بھی اور سب کے احکام بھی بتائے ہیں، آخر میں خلع، ایلاء، حلالہ، عدت، نان نفقہ اور حضانت کے مسائل بھی تحریر کیے ہیں، انھوں نے ایک مجلس کی تین طلاق کے حکم اور بدعی و حرام طلاق کے وقوع و عدم وقوع پر مفصل گفتگو کی ہے، اور اس سلسلہ میں ائمہ فقہ و اجتہاد کے اختلاف اور ہر ایک کے دلائل کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس سے انکی محنت و مطالعہ کا پتہ چلتا ہے، اسلامی قوانین اور عائلی مسائل پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ان مسائل پر بہت لکھا گیا ہے، یہ کتاب خاص اس موضوع پر اردو داں طبقہ کو طلاق کے احکام سے واقف کرانے کیلئے لکھی گئی، مگر اس میں روایت و حدیث اور رجال کی جو طویل بحثیں کی گئی ہیں ان کا اور مشکل الفاظ و اصطلاحات کا طبقہ متحمل نہیں ہوسکتا، کتاب مفید اور خاصی ہے۔

"ض"

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

سیرۃ النبی جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ قیمت	۵۵/=
سیرۃ النبی جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔	۵۵/=
۳۔ سیرۃ النبی جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔	۲۵/=
۴۔ سیرۃ النبی جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔	۵۵/=
۵۔ سیرۃ النبی جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔	۲۰/=
رحمت عالمؐ۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔	۶/=
۷۔ خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔	۱۳/=
۸۔ سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔	۲۲/=
۹۔ حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔	۵۵/=
۱۰۔ ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔	۲۱/=
۱۱۔ ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔	۱۵/=
۱۲۔ خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔	۴۰/=
۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔	۱۴/=
۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی)	۴۶/=
۱۵۔ نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی)	۳۹/=
۱۶۔ یاد رفتگاں۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات	۳۰/=
۱۷۔ مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔	۳۰/=
۱۸۔ مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔	۲۶/=
۱۹۔ مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں)	۲۶/=
۲۰۔ برید فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ سے خطوط کا مجموعہ۔	۱۷/=
۲۱۔ دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے	۳ ۵/

"منیجر"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

۲۹؍جون ۱۹۸۶ء سے یکم جولائی ۱۹۸۶ء تک پاکستان کی ہجرہ کانسل کی مشاورتی کمیٹی کا ایک سیمنار اسلام آباد میں تھا، جس میں ہندوستان سے مولانا ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ساتھ یہ خاکسار بھی مدعو تھا، اس میں اسلامی علوم و فنون پر سو عظیم کتابوں کا انتخاب کرنا تھا۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے، وہ الحمد للہ پہلے سے اب بہت اچھے ہیں، لیکن کمزوری ابھی تک باقی ہے، مزید علاج کے لیے بمبئی تشریف لے گئے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ذات گرامی کا سایہ ملک و ملت پر تادیر قائم رکھے، تاکہ ان سے جو مذہبی، علمی اور ملی سرچشمہ بہہ رہا ہے اس سے لوگ فیض یاب ہوتے رہیں، آمین۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی بعض اسباب کی بنا پر اسلام آباد نہ پہونچ سکے، ہندوستان کی نمائندگی صرف اسی خاکسار کو کرنی پڑی، اس میں تقریباً ۳۲ ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے، اس کا افتتاح پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے کیا، صدر محترم اور نمائندوں کا خیر مقدم ہجرہ کانسل کے صدر اور پاکستان کے مشہور ایڈووکیٹ اور صاحب نظر و فکر اہل علم جناب اے۔ کے۔ بروہی نے کیا، اس ہجرہ کانسل کے خاص مشیر اور ہر کام کو انتہائی خوش سلیقگی، تن دہی اور بالغ نظری سے کرنے والے جناب نبی احمد بخش بلوچ ہیں، جو اپنی دل نواز متحرک شخصیت کی وجہ سے اس سے پہلے کئی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، اس کانسل کے سکریٹری ڈاکٹر معز الدین ہیں جو پہلے پاکستان کی اقبال اکیڈمی کے جنرل سکریٹری اور کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال چیر کے وزیٹنگ پروفیسر رہ چکے ہیں، اب ہجرہ کانسل کی تجویزوں کو کامیاب بنانے کے لیے ان کی خدمات اس میں لے لی گئی ہیں، ان کو ہر کام کو خوش اسلوبی سے انجام تک پہونچانے میں بڑی مہارت ہے۔

اس سیمنار کی تقریبیں پاکستان کی دیرینہ روایات کے ساتھ تزک و احتشام، دھوم دھام، مہمانوں اور نمائندوں کی پوری خاطر داری، دل نوازی اور دلجوئی کے ساتھ انجام پائیں، شروع کے دو روز کی تقریبیں اسلام آباد میں ہوئیں، آخری روز اس کی ایک نشست نتھیا گلی میں ہوئی، جہاں سرکاری حکام نے نمائندوں کا خیر مقدم کیا، افسوس کہ بعض اسباب کی بنا پر اس میں شرکت نہ کرسکا، اس سیمنار میں اسلامی علوم و فنون پر جو ۱۰۰

کتابیں بحث و مباحثہ کے بعد منظور ہوئیں ان کے نام یہاں پر اس لیے درج کیے جارہے ہیں کہ ہمارے قارئین بھی اس انتخاب سے باخبر ہو کر اپنی عظیم الشان علمی وراثت سے واقف ہوجائیں، جس فن وار طریقہ سے ان کتابوں کی فہرست تیار کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

---

(۱) **قرآنی علوم**: الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی (۲) **علوم حدیث**: سرو الصحائف (نسخۂ خطیہ) (۳) مقدمہ فی علوم الحدیث، ابن الصلاح (۴) **فن تصوف**: کتاب اللمع، ابو نصر السراج (۵) کشف المحجوب، شیخ ابوالحسن علی ہجویری (۶) کیمیائے سعادت، الغزالی (۷) **اخلاقیات**: کتاب تہذیب الاخلاق، ابن مسکویہ (۸) **تقابل مذاہب**: کتاب الملل و النحل، شہرستانی (۹) **تعلیمات**: الرسالۃ المفصلۃ لاحوال المتعلمین و احکام المعلمین، القابسی (۱۰) ایہا الولد، الغزالی (۱۱) تعلیم المتعلم و طریق التعلم، الزرنوجی (۱۲) تذکرۃ السامع و المتکلم، ابن جماعہ (۱۳) مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ طاش کبری زادہ (۱۴) جامع بیان العلم و فضلہ، ابن عبد البر (۱۵) **فہرست کتب**: الفہرست، ابن الندیم (۱۶) **فلسفہ**: کتاب فی الفلسفۃ الاولیٰ، الکندی (۱۷) رسالہ حی ابن یقظان، ابن الطفیل (۱۸) **نفسیات**: کتاب النفس، ابن باجہ (۱۹) کتاب النفس والروح و شرح قواہما، الرازی، (۲۰) **منطق، طبیعیات، فلسفہ و کلام**: کتاب الاشارات و التنبیہات ابن سینا (۲۱) رسائل اخوان الصفا و خلان الوفا، الرسالۃ الجامعۃ (۲۲) محصل افکار المتقدمین و المتاخرین، فخر الدین رازی (۲۳) الکتاب المعتبر فی الحکمۃ الالٰہیۃ، ہبۃ اللہ (۲۴) حجۃ اللہ البالغۃ، شاہ ولی اللہ دہلوی، (۲۵) المواقف فی علم الکلام، عضد الدین الایجی (۲۶) معیار العلم، الغزالی (۲۷) حکمۃ الاشراق، شہاب الدین سہروردی (۲۸) شواہد الربوبیۃ، صدر الدین شیرازی

---

(۲۹) **خوابوں کی تعبیر**: خلاصۃ الکلام فی تاویل الاحکام، جلال الدین شیرازی یا کتاب القادری فی التعبیر، ابو سعید نصر الدینوری (۳۰) **سیاسی افکار و نظام**: رسالہ فی آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ، الفارابی (۳۱) الطرق الحکمیۃ فی السلسلۃ الشرعیۃ، ابن القیم الجوزی (۳۲) کتاب الاموال، ابو عبید (۳۳) کتاب الوزراء و الکتاب الجہشیاری (۳۴) معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ، ابن الاخوۃ، (۳۵) **تجارت**: کتاب الاشارۃ الی محاسن التجارۃ، ابو الفضل جعفر الدمشقی (۳۶) **کارواں کے**